بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ مرحوم

اور اُن کے

افکار و خیالات پر ایک نظر

تالیف

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

دار الدعوة السلفیة • لاہور

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

اور انکے

افکار و خیالات پر ایک نظر

تالیف

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

دار الدعوۃ السلفیہ ● لاہور

سلسلہ مطبوعات ع ۲۵

طابع ـــــــــ محمد سلیمان انصاری

ناشر ـــــــــ دار الدعوۃ السلفیہ، لاہور

مطبع ـــــــــ زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور

طبع ـــــــــ دوم

تاریخ اشاعت ـــــــــ صفر ۱۴۰۶ھ (نومبر ۱۹۸۵ء)

خط و کتابت کا پتہ

دار الدعوۃ السلفیہ

شیش محل روڈ • لاہور ع ۲

فون • ۵۴۴۰۶

فہرست مضامین

—— ۳ ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

(طبع دوم)

زیرِ نظر کتاب اوّل —— صادقینِ صادق پور اور علمائے اہلِ حدیث —— مولانا عبیداللہ سندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ —— جو پہلے —— شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، استدراک و تنقیح —— کے نام سے آج سے بیالیس سال قبل (۱۳۶۳ھ میں) مکتبہ دین و دانش پٹنہ (ہند) سے شائع ہوئی تھی، کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

موضوع کی مناسبت سے اس دوسرے ایڈیشن میں کتاب کا نام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ البتہ کتاب کا دوسرا حصہ، جس میں مؤلف مرحوم نے مولانا سندھی مرحوم پر لکھی گئی کتاب (از پروفیسر محمد سرور) پر مختصر نقد و تبصرہ کیا تھا، اس کا سابقہ نام ہی رہنے دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کا اظہار بھی شاید خالی از دلچسپی نہ ہو کہ اس کا پہلا ایڈیشن جب طبع ہوا تھا تو حضرت الاستاذ المحترم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ تعالیٰ کا ایماء و تعاون اس میں شامل تھا جیسا کہ مؤلف مرحوم نے بھی اپنے دیباچے (تقریب) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب "معارف" میں مولانا مسعود عالم ندوی کا یہ تنقیدی مضمون شائع ہوا تو حضرت الاستاذ، جو پہلے ہی مولانا سندھی کی کتاب سے سخت مضطرب اور بے قرار تھے، بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے مولانا ندوی کو اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کی پیش کش کی، اثبات میں جواب آنے پر اُستاذ المحترم نے مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب (روڑی ضلع حصار، آنجہانیاں سے، جو اتفاقاً اس وقت فیروز پور تشریف لائے ہوئے تھے۔ ذکر کیا۔ حکیم صاحب مرحوم نے مسلکی حمیت اور صادقینِ صادق پور سے عقیدت کی بنا پر کتاب کی اشاعت کے لئے دو صد روپے عنایت فرمائے، جو مولانا ندوی کو پٹنہ روانہ کر دیے گئے۔ اور اس رقم سے کتاب کی اشاعت عمل میں آئی۔ یوں کتاب کے طبع اوّل میں بھی حضرت الاستاذ المحترم حفظہ اللہ کا جذبۂ صادقہ کارفرما رہا اور اب

کتاب کا یہ دُوسرا ایڈیشن بھی اُستاذِ محترم دام ظلہ کا قائم کردہ ادارہ ہی ان کی حسبِ خواہش شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

یہ کتاب پہلے لیتھو پر چھپی تھی، اب جدید ذوق اور معیار کے مطابق اسے آفسٹ کی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں طبعِ اوّل میں ذیلی عنوانات نہیں تھے۔ راقم نے حسبِ ارشاد حضرت الاستاذ المحترم کتاب کو تین حصوں میں منقسم کر کے اس کے ذیلی عنوانات قائم کر دیئے ہیں۔

نیز مُصنّف مرحوم نے اَعلام کے ساتھ سنینِ وفات کا التزام کیا تھا، البتہ بعض حضرات کی تاریخ وفات غالباً انہیں نہ مل سکی تھی، اس لئے بریکٹ کی شکل میں بیاض چھوڑ دی گئی تھی، راقم نے کوشش کر کے وہاں تاریخ وفات درج کر دی ہے۔

چند مقامات پر توضیحی حواشی بھی دیئے گئے ہیں۔

بطور تعارف راقم نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم (مؤلفِ کتاب) کے مختصر حالاتِ زندگی اور خدمات پر ایک مضمون بھی تحریر کر دیا ہے۔ نیز حضرت اُستاذ المحترم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ تعالیٰ کی چودہ سال قبل کی ایک تحریر شاملِ اشاعت کر دی ہے جس میں انہوں نے مولانا مسعود عالم ندویؒ سے ربط و تعلق کی مختصر سرگذشت بیان فرمائی ہے جس سے مولانا مرحوم کی شخصیت پر مزید روشنی پڑ جاتی ہے۔

بہر حال کوشش کی گئی ہے کہ گو نقاش (مصنّف) اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ رحمہ اللہ تعالےٰ مگر اس کا یہ نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے ہر لحاظ سے بہتر ہو۔

(حافظ) صلاح الدین یوسف

رفیق المجلس العلمی السّلفی، دار الدعوۃ السّلفیہ، لاہور

محرم الحرام ۱۴۰۶ھ • ستمبر ۱۹۸۵ء

حافظ صلاح الدین یوسف

مؤلفِ کتاب مولانا مسعود عالم ندویؒ

مختصر سوانح اور خدمات

مولانا مسعود عالم ندوی کی پیدائش ۲۱ محرم ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۹۱۰ء کو صوبہ بہار کے ایک گاؤں "اوگانواں" میں ہوئی۔ یہ گاؤں ضلع پٹنہ کے ایک قصبے بہار شریف میں واقع ہے۔ اسی کے قریب ان کے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا وطن دیسنہ بھی واقع ہے۔

ان کے والد مولانا حکیم سید ابوالفتح عبدالشکور کا شمار صوبہ بہار کے چند بلند پایہ علماء میں سے ہوتا تھا۔ تدریس کے ساتھ حکمت کا شغل بھی تھا۔ آپ کے دادا مولانا سید خدابخش صاحب بھی اپنے وقت کے اچھے عالم اور اہل حدیث تھے۔ آپ کا ننھیال بھی اہلحدیث اور مشہور اہل حدیث عالم مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کا شاگرد تھا۔ مولانا مرحوم بھی معروف معنوں میں گو اہلحدیث کہلانے سے گریز کرتے تھے۔ تاہم سلفیت میں نہایت پختہ تھے۔

ابتدائی عربی تعلیم والد ماجد سے اور مدرسہ "عزیزیہ" پٹنہ میں حاصل کی، پٹنے میں ہی نویں جماعت تک اسکول کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر عربی ادب کا شوق انہیں "ندوۃ العلماء" لکھنؤ لے گیا۔ جس کی طرف مولانا سید سلیمان ندویؒ نے رہنمائی فرمائی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں ندوہ کے آخری سال میں داخلہ لیا اور نہایت ممتاز حیثیت میں وہاں کے سالانہ امتحان میں کامیابی حاصل کی اور مزید دو سال ندوہ میں قیام کرکے "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" کے عنوان پر مقالہ تیار کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

فراغت کے بعد پھر اپنے وطن (بہار) واپس آگئے اور انگریزی پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ کہ انہی ایام میں حجاز سے ادیب شہیر ممتاز اہل حدیث عالم شیخ تقی الدین الہلالی دار العلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ میں بطورِ اُستاد عربی ادب تشریف لے آئے۔ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو چونکہ عربی ادب و انشاء کا خاص ذوق تھا، اس لیے وہ دوبارہ ندوہ میں آگئے اور ہلالی صاحب سے خوب کسبِ فیض کیا اور اپنی آخری زندگی تک ان سے علمی استفادہ جاری رکھا۔

۱۹۳۲ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ایک عربی ماہنامہ کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ اس کی ادارت کے لئے مولانا مسعود عالم صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ وہی عربی پرچہ ہے جو "الضیاء" کے نام سے مشہور ہے اور جو ہندوستان کا پہلا عربی پرچہ تھا۔ یہ اگرچہ کل چار سال جاری رہا، لیکن زبان کی صحت، حُسنِ انشاء اور مضامین کی بلندی کے لحاظ سے عربی ممالک کے علمی و ادبی حلقوں میں نہایت وقیع نظروں سے دیکھا گیا۔ اور اس کی وجہ سے مسعود صاحب کا عالمِ عرب میں بھی خاصا تعارف ہو گیا۔

۱۹۳۷ء میں کچھ عرصہ اخبار "مدینہ" بجنور میں بھی کام کیا اور پھر اسی سال آپ کا پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں بطور کیٹلاگر (مُرتّب فہرست) تقرر ہو گیا۔ تقریباً سات سال دسمبر ۱۹۳۷ء تا اکتوبر ۱۹۴۴ء آپ لائبریری سے وابستہ رہے۔ قیامِ پٹنہ کے دوران ہی میں اپنی محققانہ تالیف ـــــ محمد بن عبدالوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مُصلح ـــــ مُرتّب کی۔

دارالعلوم ندوہ کے قیام ہی کے زمانے میں "ترجمان القرآن" کے مطالعے کی وجہ سے مولانا مودودی صاحب کے بھی عقیدت مند اور مدّاح تھے۔ چنانچہ جب اگست ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی تو مولانا مسعود صاحب بھی اس کے رکن بن گئے اور صوبہ بہار کی جماعتِ اسلامی کے امیر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں مولانا مودودی صاحب کی خواہش پر پٹنہ سے پنجاب (پٹھانکوٹ، مرکز جماعت اسلامی) منتقل ہو گئے۔ مولانا مودودی صاحب کا خیال تھا کہ ایک عربی ماہنامے کا اجراء کیا جائے اور اپنی تالیفات کو عربی کا جامہ بھی پہنایا جائے۔ مولانا مسعود صاحب کو انہی دو کاموں کی غرض سے پٹھانکوٹ بلوایا گیا تھا۔ لیکن مولانا مسعود صاحب کو پٹھانکوٹ (مشرقی پنجاب) کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ بالآخر منصوبے کے لئے جالندھر کا انتخاب ہوا۔ اور وہاں مذکورہ مقاصد کے لئے "دارالعروبۃ للدعوۃ الاسلامی" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۴۷ء تک مولانا مسعود صاحب کا

قیام یہیں رہا۔ عربی پرچے کا اجراء تو نہیں ہو سکا۔ تاہم ان کی نگرانی میں بعض کتابوں کو عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اور خود انہوں نے اسلامی تحریک کی تاریخ عربی میں "غربۃ الاسلام فی الھند" کے نام سے لکھنی شروع کی۔

قیامِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی کے ساتھ مولانا مسعود عالم بھی لاہور تشریف لے آئے اور راولپنڈی میں "دار العروبۃ" کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ یہاں مولانا مسعود عالم نے مولانا مودودی کے بعض رسائل کا عربی میں ترجمہ کیا۔

۱۹۴۹ء میں بعض عرب ممالک کا دورہ کیا اور وہاں پہلی مرتبہ ان کے ذریعے سے مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کی دینی خدمات کا تعارف ہوا۔ اس سفر کی رُوداد مولانا مرحوم نے "دیارِ عرب میں چند ماہ" کے نام سے مرتب کی، جو کتابی شکل میں چھپ چکی ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں جماعت اسلامی کے بعض رُفقاء سمیت گرفتار ہوئے اور چار مہینے سے زیادہ پسِ دیوارِ زنداں رہ کر سنّتِ یُوسفی بھی ادا کی۔

۲۰-۲۲ سال سے مرضِ تنفّس میں مُبتلا تھے۔ جب کبھی مرض کا حملہ ہوتا تو تکلیف بہت زیادہ بڑھ جاتی، تاہم مرض میں افاقے کے بعد اپنے علمی و دعوتی منصوبوں میں مصروف ہو جاتے۔ زندگی کا کارواں اسی طرح صورتِ خورشید (کبھی ڈوبتا، کبھی نکلتا) رواں دواں رہا۔ تا آنکہ ۱۶ مارچ ۱۹۵۴ء کو کراچی میں مرض کا ایک سخت دَورہ پڑا اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اور اب کراچی میں ہی آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ غفر اللہ لہ و رحمہ

تصنیفات

مولانا مرحُوم نے اپنے پیچھے چند یادگار تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ ان کی سب سے اہم تصنیف (عربی میں) وہ ہے جس کا ذکر "غربۃ الاسلام" کے عنوان سے پہلے آ چکا ہے لیکن بعد میں اس کا نام انہوں نے "تاریخ الدّعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" رکھ دیا تھا۔ مگر افسوس یہ کتاب ابھی تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ البتہ اس کا خلاصہ "نظرۃ اجمالیۃ فی التاریخ الدّعوۃ الاسلامیۃ" کے نام سے طبع ہوا تھا۔ اب وہ بھی نایاب ہے۔

۲۔ "محمّد بن عبدالوہاب: ۔ ایک مظلوم اور بدنام مُصلح"

۳۔ اسلام اور اشتراکیت۔

۴ ۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۔

۵ ۔ دیارِ عرب میں چند ماہ (سفر نامہ)

۶ ۔ الترجمة العربية

۷ ۔ مولانا مودودی کے رسائل "دینِ حق"، "اسلام اور جاہلیت"، "شہادتِ حق"۔ اور "جہاد فی سبیل اللہ" کا عربی ترجمہ ۔

۸ ۔ محاسنِ سجاد ۔ مولانا محمد سجاد بہاری (مشہور خلافتی لیڈر) کی زندگی اور شخصیت پر مضامین کا مجموعہ، جسے مولانا نے مرتّب کر کے شائع کیا تھا، جس میں ان کے قلم سے بھی ایک دردناک مضمون شامل ہے ۔

۹ ۔ "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر" یہی وہ کتاب ہے، جواب "صادقینِ صادق پور اور علمائے اہلحدیث ـــ مولانا عبید اللہ حنفی کے الزامات کا جائزہ" کے عنوان سے قارئینِ کرام کے ہاتھوں میں ہے ۔

۱۰ ۔ "مولانا عبید اللہ سندھی" پر ایک ناقدانہ جائزہ" جو پروفیسر محمد سرور (جامعی) مرحوم (متوفیٰ ستمبر ۱۹۸۳ء) کی لکھی ہوئی کتاب پر نقد و تبصرہ ہے اور زیرِ نظر کتاب کے ساتھ مطبوع ہے ۔

اِن مستقل تالیفات کے علاوہ مولانا کے عربی اُردو رسائل میں متعدد مضامین چھپے ہوئے ہیں. جو ابھی تک مرتّب نہیں کیے جا سکے ۔

(ماخذ ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی، مولانا مسعود عالم ندوی نمبر۔ مطبوعہ مارچ ۱۹۵۵ء)

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ تعالیٰ

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

آہ! کیسی یاد تازہ ہوئی۔ غالباً ۱۹۴۲ء کا لگ بھگ ہوگا کہ مشہور دیوبندی عالم و مفکر مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی کتاب "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" لاہور سے شائع ہوئی تھی جس میں شاہ ولی اللہ کے فکر کو اپنے مخصوص سیاسی نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ شہیدینؒ کی تحریک جہاد کے سلسلے میں تاریخ نویسی کے بجائے "تاریخ سازی" سے کام لیا گیا تھا خصوصاً مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، صادقینِ صادق پورؒ، بعض اعاظم علمائے اہل حدیث ہندؒ اور امام شوکانیؒ وغیرہم کے بارے میں عجیب و غریب مغالطے پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

اس کتاب کے مستشرقانہ قسم کے مندرجات پر ایک ندوی فاضل کے قلم سے مجلہ "معارف" اعظم گڑھ (ہند) کے چند شماروں میں بھرپور علمی اور تحقیقی تنقید شائع ہوئی جسے حلقۂ علمائے حق میں بہت پسند کیا گیا اور یہ فاضل ندوی مولانا مسعود عالم ندوی ـــ رحمۃ اللہ علیہ ـــ تھے جو ان دنوں عظیم آباد پٹنہ (ہند) کی مشہور "خدابخش لائبریری" میں فہرست مرتب کرنے کی غرض سے مقیم تھے۔

اسی اثناء میں "مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار و تعلیمات" عنوان سے ایک دوسری ایسی کتاب طبع ہوگئی جو دینی لحاظ سے انتشارِ فکری کا شاہکار تھی۔ اس کا بھی مرحوم ہی نے غیرتِ دینی سے بے قرار ہوکر "ناقدانہ جائزہ" لے ڈالا جو "معارف" ہی (غالباً ۱۹۴۲ء کے آخری کسی مہینے) میں اشاعت پذیر ہوا۔

راقم السطور ان دنوں فیروز پور شہر (مشرقی پنجاب) میں تھا۔ ارادہ ہوا کہ "معارف" کے ان بلند پایہ مقالات کو کتابی صورت میں شائع کردیا جائے تاکہ ان کی افادیت کو عمومیت و پائندگی حاصل ہوجائے۔

گو سابق تعارف نہ تھا تاہم خط و کتابت کی گئی۔ موصوف نے نفس تجویز سے اتفاق کیا لیکن طے یہ پایا کہ کتاب مؤلف کی زیرِ نگرانی پٹنہ میں طبع ہو جس کے اخراجات ہماری طرف سے پٹنہ روانہ کردیئے جائیں، چنانچہ رقم بھیج دی گئی اور چند ماہ کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بصیرت افروز

مقدمہ کے ساتھ" مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" نام سے ۱۶۴ صفحات (کتابی سائز) پر مشتمل ایک کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گئی۔ وَلِلّٰہِ الحمد۔ جس پر ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ تاریخ مندرج ہے ـــــ کتاب میں وہ خط و کتابت بھی شامل کر دی گئی جو اس دوران صاحب مقالات اور مولانا سندھی کے درمیان ہو چکی تھی۔

اب ہمارے تعلقات میں مزید استواری پیدا ہو گئی۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ مستقل قیام کے لئے پنجاب آنا چاہتے ہیں۔ ادھر سے بکمال خوشی آمادگی ظاہر کر دی گئی چنانچہ (غالباً ۱۹۴۵ء میں) فیروز پور شہر آ گئے اور کم و بیش چھ ماہ میرے ہاں اُن کا قیام رہا لیکن چونکہ دمہ کے دائمی مریض تھے۔ فیروز پور شہر کی آب و ہوا راس نہ آئی اور اس اثناء میں جماعت اسلامی سے بھی گہرا رابطہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے خوب سوچ بچار کے بعد جالندھر (مشرقی پنجاب) میں اُنہوں نے اپنی رہائش منتقل کر لی اور قیامِ پاکستان کے بعد چند مقامات کا تجربہ کر کے راولپنڈی ٹھہر گئے اور" دار العروبہ" نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا تا آنکہ مارچ ۱۹۵۴ء (رجب ۱۳۷۳ھ) عین جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون، غفر اللہ لہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

مولانا مسعود عالم کے ذاتی حالات کا راقم کو اسی قدر علم ہے کہ آپ کے ماموں مولانا سیّد عبد الکبیر صاحب بڑے جیّد اہل حدیث عالم تھے جو مولانا محمد سعید بنارسی (م ۱۳۲۲ھ) کے تلمیذ رشید، ان کے دار الحدیث کے معلّم اور ان کے اشاعتی کاموں میں مددگار و معاون تھے ـــــ مولانا مسعود عالم کی والدہ محترمہ بھی مسلک اہل حدیث میں نہایت پختہ تھیں، پھر ندوہ میں ان کو شیخ تقی الدین ہلالی المراکشی اُستاذ مل گئے جو اعتقاداً و عملاً پختہ اہل حدیث ہیں اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا مسعود عالم بنیادی طور پر اہل حدیث تھے۔ اگرچہ اسی دور ۱۹۴۰ء ـــــ ۱۹۴۷ء کے ملکی حالات کے نتیجے میں تحریک اسلامی کے سیاسی نظریات" اور فکر و عمل میں ان پر" ندویت" غالب تھی۔ چنانچہ ایسے معاملات میں تو ہم دونوں کی راہیں مختلف رہیں مگر اس اختلافِ منہاج کا ہمارے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اوّل سے آخر تک یکساں رہے اور اسی قدر نہیں بلکہ ادارہ" الاعتصام" سے بھی تا حینِ حیات ان کا نہایت مخلصانہ رابطہ برابر قائم رہا ـــــ مولانا مسعود عالم کی تحریری یادگاروں میں ہمارے نزدیک اعلیٰ درجہ کی ان کی تالیف" محمد بن عبد الوہاب" ایک بدنام اور مظلوم مصلح" کتاب ہے جو جامعیت اور اخلاص میں تا حال منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

(منقول از ہفت روزہ" الاعتصام" لاہور ۱۰ استمبر ۱۹۷۱ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

(از مصنّف)

زیرِ نظر کتاب میں راقم کے دو مضمون شائع ہو رہے ہیں، جو اس نے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" اور پروفیسر محمد سرور کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و تعلیمات" پر تنقید اور استدراک کے طور پر لکھے تھے، پہلا مقالہ مولانا کی زندگی میں شائع ہوا (معارف، فروری - مئی سنہ ۴۳ء) اور ان کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ناقد کو مسلسل پانچ خط بھی لکھے، جن میں اُنہوں نے اپنے افکار کی مزید توضیح کی تھی، وہ خطوط بھی بشش کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں، تاکہ مولانا کے افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو، نیز اسی "استدراک" کے سلسلے میں مولانا نے بسترِ علالت سے (وفات سے تقریباً دو ہفتے پیشتر) بھی ایک خط اپنے پرائیویٹ سیکرٹری (پرسنل اسسٹنٹ) سے لکھوا کر بھجوایا تھا۔ وہ بھی ان "خطوط" کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے، ان خطوط کے علاوہ مولانا نے بُرہان دہلی (مئی سنہ ۴۳ء) میں بھی اپنے افکار کی مزید تشریح اور "استدراک" کے بعض شبہات کی تصحیح کی تھی۔ بُرہان کے اس مضمون اور ان کے تمام خطوط میں تقریباً ایک ہی خیال کا اعادہ کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون جون سنہ ۴۴ء میں لکھ کر معارف کو بھیجا جا چکا تھا، مگر اتفاق یہ کہ وہ جولائی یا اگست میں نہ چھپ سکا، اور اسی دوران میں مولانا سندھی کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون — خبر سنتے ہی دل بیٹھ گیا، اور افکار و عقائد کے انتہائی اختلاف کے باوجود یہ صدمہ صبر آزما ثابت ہوا۔

——— اللہ ان کا مقام بلند کرے اور ان کی خدمات کے عوض، ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے

——— ایسے بالغ نظر، انتھک کام کرنے والے اور وسیع القلب انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوں تو "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" پر استدراک، کے چھپتے ہی کتابی صورت میں اس کی اشاعت کا تقاضا شروع ہو گیا تھا، مگر کاغذ کی کمیابی، اور دوسری مشکلات کے باعث یہ تقاضا اب سے پہلے عملی جامہ نہ پہن سکا۔ خیال تھا کہ اشاعت کے وقت بعض مضامین کا اضافہ ہو سکے گا، نیز "برہان" میں مولانا کی بعض جدید توضیحوں کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جا سکے گا، مگر اب کہ مولانا ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، دل و دماغ مزید کاوش کے لئے تیار نہیں، یہ مقالے بھی احساس فرض سے مجبور ہو کر شائع کئے جا رہے ہیں۔ اور حاشا او کلّا!! ان سے مولانا کی تردید نہیں بلکہ ان کے افکار و خیالات کی تنقید و تنقیح مقصود ہے: کتاب کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہو گی کہ ہم مولانا کے "نئے افکار" سے متفق نہیں، اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ ان کے "جدید نظریے" "کتاب و سنت کے صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، اس لیے ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں، خواہ اس میں جذباتِ محبت و عقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو؟ کہ حق کی تائید تعلقات و محبت کی پاسداری پر مقدم ہے۔

فالحق اولی من ولیك حرمةً — و احق منك بنصرةٍ و کفاح (شوقی)

کاغذ کی نایابی اور ہوش رُبا گرانی کے اس دور میں شاید یہ کتاب شائع نہ ہو سکتی۔ اگر محب محترم مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف (فیروزپور) کا پیہم اصرار نہ ہوتا، اور برادرِ عزیز مولوی محمد تقی الدین صاحب نعمانی (منیجر مکتبہ دین و دانش، بانکی پور، پٹنہ) کی مستعدی دوسرے مشکلات کے حل کی کفیل نہ ہو جاتی، اور ان کے ساتھ برادرِ عزیز سید محی الدین صاحب اصلاحی ندوی مالک برقی پریس پٹنہ کاغذ کی فراہمی کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے لیتے ——— اللہ ان صاحبوں کو اجر دے کہ محض لوجہ اللہ، انہوں نے یہ تکلیف برداشت کی۔ اور ایک دینی و علمی خدمت کی انجام دہی میں ایک نحیف و ناتواں بندے کا ہاتھ بٹایا۔

آخر میں استاذِ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی (متعنا اللہ بطول بقائہ) کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے خادم کی درخواست پر ایک بے لاگ اور دل نشیں مقدمہ تحریر فرما کر کتاب کی عزت بڑھائی اور ناظرین کتاب کے لئے بصیرت اور روشنی کا سامان فراہم کیا۔ فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

مہندرو، پٹنہ ۲۵ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۳ھ — عاجز: مسعود عالم ندوی

"معارف" کا ادارتی نوٹ

از مولانا سید سلیمان ندوی

ذیل کا مختصر نوٹ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا اس وقت کا رقم فرمودہ ہے۔ جب مولانا مسعود عالم ندویؒ کی یہ کتاب بصورتِ مضمون پہلی مرتبہ (۱۹۴۳ء میں) ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں جب یہ مضمون کتاب کی شکل میں شائع ہوا تو اس "معارف" کے نوٹ کو اس میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ سید صاحب موصوف کا ایک مستقل مقدمہ زینتِ کتاب ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اَب مقدمے کے ساتھ ساتھ سید صاحبؒ کی یہ فاضلانہ ابتدائی تحریر بھی شاملِ کتاب کرلی گئی ہے۔ (ناشر)

مضمونِ ذیل میں ایک عزیز نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک" متن مع شرح پر ایک تبصرہ لکھا ہے۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ مولانا موصوف حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و رسائل پر بہت عمیق نظر رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ یہ کہ شاہ صاحب کے مُتفرّق مسائل کو اُنھوں نے اپنے خیالات اور نظریوں کے مطابق اس طرح منظّم کرلیا ہے کہ گویا شاہ صاحب کا مخصوص فلسفہ تیار ہوگیا ہے۔ یہ بحث دوسری ہے کہ شاہ صاحب کے ایک فقرے سے کہیں پُورا باب اور کہیں شاہ صاحب کے پُورے باب سے صرف ایک فقرہ لے لیا گیا ہے اور اس طرح حسبِ خواہش فلسفہ تیار ہوگیا ہے۔

بہر حال مولانا اگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پُورے فلسفے کو جس کو اُنھوں نے اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے، کاغذ کے صفحوں میں ترتیب دے دیں تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ اس سے ایک فائدہ جہاں یہ پہنچے گا کہ حضرت شاہ صاحب کے علُوم منظّم ہو کر ناظرین کے سامنے آجائیں گے وہاں یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا کہ خود مولانا سندھی اور اُن کے پُورے مدّعا کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی ورنہ پوری داستان کا اوّل

ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پھیلنا بات کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا اور مقاصد کا منتشر کر دینا ہے۔

معارف میں اس کتاب پر جو مختصر تبصرہ شائع ہوا تھا، اس کتاب کے جواب میں مولانا سندھی کا مکرمت نامہ آیا ہے، اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ موصوف کے خیالات جو لوگ شائع کر رہے ہیں وہ ادھوری صورت میں ہیں اور اس طریق اشاعت سے بہت سے گوشے ناتمام رہ جاتے ہیں اور مصنف بہت سے جھوٹے سچے الزامات کا نشانہ بن جاتا ہے۔

مولانا سندھی کے نزدیک سید شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شیم کانیت اور وہابیت، یا صریح لفظ کہیئے کہ غیر مقلدیت کی آمیزش ہو گئی تھی، اور غالباً اس موجودہ رد و قدح کا مرکز بھی یہی خیال ہے مگر جہاں تک خاکسار کے علم کا تعلق ہے اس تحریک کے علم برداروں میں فقہی جنگ و جدال یا آمین اور رفع یدین کے ذریعے ردِّ بدعت یا اتباع سُنّت کا خیال کبھی راہ نہیں پایا، سید شہیدؒ، مولانا شہیدؒ اور دوسرے وابستگان دامن کی تحریر و تقریر و مناظرہ اور خطوط و مکاتیب وغیرہ موجود ہیں، اُن سے استناد کرنا چاہیئے، تحریک کا مقصود عقائد کی صحیح اصلاح، اعمال کی اصلاح، توحید کی اشاعت، باطل کا ردّ اور رسومِ فاسدہ کا ازالہ اور احکامِ اسلامی کا اِجراء تھا۔ باقی حکایات و روایاتِ احاد اس باب میں سند کے قابل نہیں، خواہ کسی جانب سے ہوں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس تحریک نے اتباعِ سُنّت کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس کے اثر سے کچھ لوگوں کو وہ کُتبِ احادیث کے دفتر میں جو چیز اول وہلہ میں سُنّت ثابت ہوتی نظر آئی ہے۔ اس کے قبول کر لینے میں کوئی تقلیدی خیال ان کو باز نہ رکھ سکا۔ سر سیدؒ کے ایک خط سے' جو مولانا ابراہیم صاحب آروی شاگردِ رشید مولانا سیّد نذیر حسین صاحب دہلویؒ کے نام ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نذیر حسین صاحب نے آمین بالجہر اور رفع یدین پر عمل سر سیدؒ کی حوصلہ افزائی سے شروع کیا۔

مولانا ابوالکلام کے والد ماجد جو اس تحریک کے شدید مخالفین میں تھے، اس کو بنی اسرائیل کی طرح دو سلسلوں میں منقسم کرتے تھے، اسماعیلی اور اسحاقی اور دونوں کو برسرِ باطل کہتے تھے، اسماعیلی سے ان کا مقصود مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے تبع یعنی حضرات اہل حدیث اور اسحاقی سے مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی کے پیرو کار یعنی حضرات دیوبند تھے۔ آج کل ظرافت سے' پہلے کو لال وہابی اور دوسرے کو گلابی وہابی کہا جاتا ہے۔ مگر بہر حال مخالفین کی نظر میں ہیں دونوں وہابی، مگر یہ گلاب اُن دنوں کلی تھا، پنکھڑیاں آج کی طرح الگ الگ نہیں تھیں،

اِن دونوں کے درمیان درحقیقت عقائد کا چنداں فرق نہیں۔ فرق ہے تو اس کا کہ ایک فقہ میں غیر مقلد ہے اور دوسرا فقہ میں مقلد۔

مولانا سندھی گو بہت سے خیالات میں آزاد ہیں۔ مگر مقلدیت کے باب میں اُن کا تشدد علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ اس کا اثر اُن کی ہر تحریر میں نظر آتا ہے۔ موجودہ مناقشہ بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے۔ اور قاضی شوکانی اور محمد بن عبدالوہاب وغیرہ پر ان کے اشارے اسی نوعیت کے ہیں۔ بہرحال میری یہ تمہید کوئی محاکمہ نہیں بلکہ فریقین کو ایک دوسرے کے زاویۂ نظر کے سمجھانے میں سہولت بہم پہنچانا ہے۔

(ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ ہند جلد ۵۱، شمارہ ۲،
فروری ۱۹۴۳ء)

مقدّمہ

حضرت علامہ سیّد سُلیمان ندوی مدظلّہٗ[۱]

یورپ کے مادی عروج اور مسلمانوں کے مادی تنزّل نے ایک زمانے سے مسلمان مفکّرین کو مضطر اور بے چین بنا رکھا ہے، مسلمان مفکّرین میں سے سیّد جمال الدین افغانی نے اس کا علاج اتّحادِ اسلامی تجویز کیا، اور یہ دعوت دی کہ تمام مسلمان حکومتیں اور قومیں باہم مُتحد ہو کر یورپ کا مقابلہ کریں اسی اتحادِ اسلامی کا نام پین اسلامزم ہے، مرحُوم نے اپنے اس مجوزہ پروگرام کی خاطر گھر بار چھوڑ کر ہندوستان، ایران، مصر اور ٹرکی اور پیرس میں دن گزارے اور اپنے مشہور عربی رسالہ، العروۃ الوثقیٰ، کے ذریعہ سے مسلمان اقوام کو اس کی دعوت دیتے رہے اور آخر اسی دعوت کی کوششوں میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

ہندوستان میں سرسیّد احمد خان نے مسلمانوں کے تنزّل کا سبب جدید یوروپین علُوم وفنون و اختراعات و تمدّن سے ناواقفیت کو قرار دیا۔ اور اس کا علاج ایک ایسی درس گاہ کا قیام تجویز کیا جو مسلمانوں کو یوروپین تمدّن و معاشرت اور علُوم و فنون و مخترعات سے آراستہ کرے، ان کا قول تھا کہ مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز بن جاؤ۔

قومیت پرست یورپ کے اثر سے مصر، ٹرکی و ایران میں اسلامیت کے بجائے وطنیّت کی دعوت شروع ہُوئی جس میں یہ قرار دیا گیا کہ اتحادِ اسلامی کے بجائے 'اتحادِ وطنی و قومی' کی بنیاد پر نئی تعمیر شروع کی جائے، چنانچہ ان سب ملکوں میں 'وطنیت' کی دعوت نے بڑا حسنِ قبول حاصل کیا۔ مصر میں مصطفےٰ کامل، ایران میں مفتی زادہ وغیرہ نے اور ٹرکی میں نوجوان ترکوں نے اپنے انقلاب کے لئے اسی راستہ

---

[۱] مولانا ندوی مرحوم کتاب کے پہلے ایڈیشن کے وقت زندہ تھے۔ غفراللہ لہ و رحمہ (ناشر)

کو اختیار کیا۔

گذشتہ جنگ میں روس کے کامیاب انقلاب نے ایک اور منظر پیش کیا، جس سے سوشلزم، بالشویزم، کمیونزم وغیرہ کی تحریکیں سامنے آئیں۔ ان کو دیکھ کر بعض مسلمان مفکرین نے اسلامی نظام سیاست و اقتصاد و معاشرت کو بھی اسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی۔ ادھر جرمنی اور اٹلی میں اس کے رد کے طور پر نازی ازم اور فاشزم نے جنم لیا۔ بعض مسلمان نوجوانوں کو جن میں کچھ مذہبی درد تھا، اسی جنگی اور آمرانہ نظام میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا خواب نظر آیا۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے بعد سے جو مسلمان نوجوان یورپ کو گئے وہ سوشلزم یا نازی ازم میں سے کسی ایک کا شکار ہو کر واپس آئے۔ پہلا نظریہ دہلی کے خیری برادرس کی جماعت اسلامی اور امرتسر کے مشرقی صاحب کی 'خاکسار' تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خیری بھائیوں کی تحریک تو ان کے گھر کی چار دیواری ہی میں محدود رہی۔ ان کا بڑا زور وحدتِ آمریت پر ہے۔ لیکن مذہبی اصول و فروع میں انہوں نے تاویل و ترمیم نہیں کی۔ لیکن مشرقی تحریک نے وحدتِ آمریت کے ساتھ عسکریت پر زور دیا اور کوشش کی کہ اسلام کے پورے دین کو انہیں دو اصولوں پر ڈھال دیں اور ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ سراسر مادرار الحیاۃ زندگی پر مرے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کو بتایا کہ ان کی جنت و دوزخ اسی دنیا میں ہے، یورپ کی زندگی کا باغ و بہار، جنتِ ارضی اور مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی، ان کا دوزخ ہے۔ اس لئے آج یورپ اصلی مسلمان اور مسلمان حقیقی کافر ہے۔

ہندوستان پر اللہ تعالےٰ کی بڑی رحمت ہوئی کہ عین تنزل اور سقوط کے آغاز میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وجود نے مسلمانوں کی اصلاح و دعوت کا ایک نیا نظام مرتب کر دیا تھا۔ اور وہ 'رجوع الی دین السلف الصالح' ہے۔ اس دعوت نے ہندوستان میں فروغ حاصل کیا۔ اور گو سیاسی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ تاہم نظری و مذہبی و علمی حیثیت سے اس کی جڑیں مضبوط بنیادوں پر قائم رہیں، جن کو ہندوستان کا سیاسی انقلاب بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا۔ اس سیاسی انقلاب کے بعد گو اس دعوت کے ارکان ہندوستان کے مختلف اسلامی ریاستوں کو یا ہندوستان سے باہر حجاز کو ہجرت کر گئے۔ مگر چند باہمتوں نے اسی نظری و مذہبی و علمی نظریوں کی دعوت، اشاعت اور تعلیم کی غرض سے دیوبند اور سہارن پور میں اسلام کی مذہبی درس گاہوں کی بنیاد رکھی، اور ان کے ذریعہ سے افغانستان سے حجاز تک اس تحریک کو پھیلا دیا۔ اس تحریک کا اولین اصول یہ تھا کہ اسلام کو بدعات سے پاک کر کے علم و عمل میں سلف صالحین

کی راہ پر چلنے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے اور مسائل فقہیہ میں فقہائے محدثین کے طرز کو اختیار کیا جائے۔[1]

اسی زمانے میں یمن اور نجد میں اس تحریک کی تجدید کا خیال پیدا ہوا جس کو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں کے شروع میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے مصر و شام میں شروع کیا تھا۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ائمہ مجتہدین کی منجمد تقلید اور بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں یہ تحریک ہندوستان تک بھی پہنچی اور خالص ولی اللٰہی تحریک کے ساتھ آکر منضم ہوگئی۔ اسی کا نام ہندوستان میں اہل حدیث ہے۔

ولی اللٰہی تحریک کی یہ دونوں شاخیں تقلید و عدم تقلید کے مباحث کے علاوہ اصول میں تقریباً ایک تھیں۔ مگر افسوس کہ ان فقہی فروعات کو ان دونوں نے یہ اہمیت دی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں سالہا سال تک دست و گریباں ہو کر اپنے اصل مقصد سے ہٹ گئیں۔ یہ دیکھ کر ندوۃ العلماء کے نام سے ایک اور دعوت پیدا ہوئی، جس نے ان فروعات میں اپنا مسلک صلح کل تجویز کیا۔ اور چاہا کہ دونوں کو بغلگیر کر کے اصل مقصد کی طرف متوجہ کرے اور یہ دیکھ کر کہ جب تک ہمارے علمائے کرام کے تعلیمی نظام میں تبدیلی نہ ہوگی وہ علماء پیدا نہیں ہو سکتے جن کی ضرورت اس وقت کے مسلمانوں کو ہے، اس تعلیمی نظام کے دو جزء اہم تھے، ایک یہ کہ اسلامی فرقوں کے باہمی فروعات کے جنگ و جدال کو بند کر کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ یونانی علوم کو جن کو صرف بہ ضرورت ہمارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا۔ ان کو علیحدہ کر کے ان کے بجائے یورپ کے وہ جدید علوم اختیار کئے جائیں جن پر موجودہ عقلیت کی بنیاد ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ٹرکی کی بربادی اور ممالکِ اسلامیہ کی تجزیہ نے ہندوستان کے ان مسلمانوں کو جو اب تک اپنے کو ایک خلافت کے مرکز سے وابستہ سمجھتے تھے بے حد متاثر کیا۔ اس نے خلافت کے نام سے ایک نہایت پرجوش تحریک کا آغاز ہوا جس کی وسعت میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کی ہر مسلمان قوم آگئی۔ یہ حقیقت میں اتحادِ اسلامی کی تحریک کا آخری سنبھالا تھا۔ خیال تھا کہ یہ قوت شاید مسلمانوں

---

[1] لوگوں نے اس کو بھی مختلف فیہ مسئلہ بنا رکھا ہے کہ وہ فقہ میں کیا تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اپنے سوانح الجزء اللطیف کے آخر میں اپنے کو خود ہی بتا دیا ہے کہ وہ کیا تھے، فرماتے ہیں: "و بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشاں و احادیثے کہ متمسک ایشاں است قرار داد خاطر بمدد نور غیبی روش فقہاء محدثین افتاد۔"

کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام لائے گی۔ اس تحریک کے تین اصول اساس تھے مسلمان خلافت الٰہی کے حامل ہیں۔ ان کا ارضی مرکز جزیرہ نمائے عرب، اور سیاسی مرکز ترکی خلافت ہے۔ لیکن عین اس وقت جب یہ تحریک شباب پر تھی، مصطفےٰ کمال پاشا نے الغائے خلافت کا اعلان کیا۔ اور ترکی کو اسلامی اقوام کی نمائندگی کے عہدہ سے علیحدہ کرکے ایک ترکی قوم کی بنیاد ڈالی جس نے اسلام کے ہر رشتہ کو توڑ کر یورپ کے ہر نظام کو ترکی قومی رنگ دے کر قبول کرلیا۔ اس اعلان نے ہندوستانی مسلمانوں کی خلافت نام اسلامی تحریک کی قوت کو بالکل ختم کردیا۔

زمانہ کی نیرنگی دیکھئے کہ پنجاب کے علاقہ سیال میں ایک سکھ خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس نے سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اور بعض علماء کے زیر تربیت عربی تعلیم حاصل کی اور مزید تکمیل کے لئے وہ دیوبند کی درس گاہ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ میں پہنچ گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر عبید اللہ سندھی کے نام سے روشناس ہوا۔ ظاہری تعلیم کے ساتھ وہ اُس جوش جہاد سے بھی آشنا ہوا، جو منتسبان سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما کے دلوں میں موجزن تھا۔ اور جس کو ان دنوں مولانا ابو الکلام آزاد کا الہلال نئی حرکت دے رہا تھا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکی و جرمنی کے اتحاد کی قوت کے بھروسہ پر بعض مذہبی و سیاسی ارباب فکر کے خیال میں آیا کہ یہ وقت اُن کے پُرانے منصوبے کے پُورا ہونے کے لئے سب سے موزوں ہے۔ چنانچہ کچھ کام شروع ہوا مگر ابھی آغاز ہی تھا کہ قید و بند کی زنجیروں نے ان میں سے اکثروں کو قبل از وقت بیکار کردیا۔ شیخ الہندؒ نے اپنی جماعت کے ساتھ حجاز کو ہجرت کی اور آخر وہاں بھی پناہ نہیں ملی اور مالٹا میں اسیر رہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے بعض رفقاء نے ہندوستان سے نکل کر آزاد سرحد اور افغانستان کا رُخ کیا۔

قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی (رحمۃ اللہ علیہ)۔ ——— یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہوجاتی، مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ دین کا ہے۔ پھر گو وہ خود اس دنیائے دنی سے رُخصت ہوگئے۔ مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعت دوام بخش گئے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیر بحث آتے ہی رہیں گے ——— تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی اور اس کی دنیاوی برتری کے لیے ان کے

اندر بڑا جوش تھا۔

سلسلہ بیان یہ تھا کہ پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر ۱۹۱۵ء میں وہ افغانستان چلے گئے جہاں وہ مسلسل سات برس تک مقیم اور وہاں کے سیاسیات سے اُلجھتے رہے، پھر یہاں کی فضا کو بدلتی دیکھ کر ۱۹۲۲ء میں وہ روس چلے گئے جہاں بالشویکی انقلاب پُورے زور پر تھا۔ یہاں وہ اس بالشویکی تحریک سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء کے قریب وہ روس سے بھی نکل گئے، اور مصطفٰے کمال پاشا کے ٹرکی میں جا کر مقیم ہوئے۔ اور وہاں چار سال کے قریب رہ کر وہ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ ہو کر سُلطان ابن سعود کے عہد میں حجاز چلے آئے۔

یہ مختصر تاریخ اس لیے لکھ دی گئی کہ ان کے خیالات کے سمجھنے میں اس سے مدد ملے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو دفعتہً کسی تالاب سے سمندر میں پہنچ جائے ان کا تعلق ایک ایسے حلقہ سے تھا جس کو یورپ کے نئے سیاسیات سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ لیکن دفعتہً واقعات نے ان کو سیاسیاتِ عالم سے اُلجھا دیا۔ اور وقت کی اہم تحریکوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ خالص ملحدوں اور فاسقوں اور سیاسیوں اور انقلابیوں سے ملنے اور یورپ کے مختلف سیاسی و معاشرتی و اقتصادی نظامات کے دیکھنے اور ان کے نظریوں کے سُننے کا موقع ملا۔ معلوم نہیں کہ جہاں جہاں وہ رہے وہاں کی کوئی زبان بھی ان کو معلوم تھی یا نہیں۔ بہرحال یورپ کے ان سیاسی نظریوں اور انقلابی تحریکوں سے ان کے خیالات میں چکاچوندسی لگ گئی۔ ان کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ وہ کسی طرح اسلام کو اس نئی تحریک سے منطبق کر دیں، بہرحال انہوں نے روس سے سیاسی انقلاب کا سبق اور ٹرکی سے تجدد کا فن اخذ کیا۔ اور پھر جدید ٹرکی سے "وطنیت" اور یورپ کی ظاہری نقالی کے درمیان تطبیق کا نظریہ مرتب کیا۔ مختصر یہ کہ اُنہوں نے جدید روس اور جدید ٹرکی کو اپنے پُرانے علوم پر منطبق کر کے ایک نظام تیار کیا، جس کو لے کر وہ ہندوستان وارد ہُوئے، اور "حکمت ولی اللہ" کے نام سے اس کو پیش کیا۔

ان کے نزدیک اس زمانہ میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ "ہندوستانیت" اور "اسلامیت" کو کیونکر منطبق کیا جائے، اس کا جواب ان کے ذہن میں یہ آیا کہ جس طرح دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں وطنیت کا دور دورہ ہے۔ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام نے قطع نظر کر کے نسلیت اور وطنیت کے اصول پر ملک کے مختلف طبقات کو جن میں مذہب کا اختلاف ہے، متحد کیا جائے؛ قوم پرست عرب کہتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی عرب تھے، اور اب بھی عرب ہیں، ہم عیسائی ہوں،

یا مسلمان، سب عرب ہیں۔ مصری کہتے ہیں کہ ہم عرب ہوں یا ترک و کرد، یا قبطی ہم سب مصری ہیں۔ ہم کو فراعنہ پر فخر ہے۔ اور اہرام مصری کی بنیاد پر ہم اپنی قومیت کی بنیاد کھڑی کریں گے۔

اسی طرح ایران میں ایرانی، نسل و وطن کی پرستاری میں مصروف ہیں، مسلم و زردشتی اور موحد آتش پرست سب یکساں ایرانی ہیں۔ یہی حال جدید ٹرکی میں ترکی نسل کی دعوت کا ہے کہ اب وہاں چنگیز و ہلاکو پر فخر کیا جا رہا ہے۔ سلطان عثمان اور بایزید و سلیمان پر نہیں۔

مولانا سندھی نے اسی منظر کو دیکھ کر دین اور وطنیت میں تطبیق کی کوشش کی اور اس کے لیے انہوں نے اسلامی مسائل کی تشریح میں ایسی تاویلات کیں کہ وہ ان کے فلسفہ پر منطبق ہو جائے بعض حقائق صحیح بھی ہیں، تو ان کی تعبیر کا طرز ایسا اختیار کیا گیا جس سے وہ متوحش ہو گئے ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جن کو وہ صحیح متفقہ اصول سے بھی اخذ کر سکتے تھے، مگر انہوں نے ان کے لیے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا مثلاً وحدتِ انسانیت، کے مسلک کو وُحدۃ الوجود کی سنگلاخ زمین کے بجائے کتاب و سُنّت کی صاف راہ مساوات بنی آدم پر مبنی کر سکتے تھے جس کے نصوص قرآن پاک واحادیث میں موجود ہیں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ دین اور وطنیت کی تطبیق کے لیے عربی اسلام کو ہندی اسلام بنا کر یہاں کی وطنیت سے قریب کر دیا جائے، تاکہ وہ اس ملک آریہ ورت میں بیگانہ نہ سمجھا جائے۔ اور اس طرح دین ہندستان میں وطنیت کے مہلک اثر سے بچ جائے۔ چنانچہ ان کو حنفیت سے اس لیے دلچسپی نہیں کہ وہ دلائل کے لحاظ سے قوی اور اپنی حُجت کے لحاظ سے پُر زور ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان کی عصبیت اس لیے ہے کہ امام صاحب نسلاً غیر عرب بلکہ عجمی بلکہ ہندی بلکہ سندھی تھے، اور اس لیے حنفیت ہندیت ہے۔ ان کو مسئلہ وحدۃ الوجُود سے اس لیے عقیدت نہیں کہ قرآن و حدیث سے اس کی تائید مِل سکتی ہیں، اور ربطِ حادث یا قدیم کے فلسفیانہ مُعمّے کا حل اس کے ذریعہ سے آسانی سے ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ یہ مسئلہ ہندو ویدانت میں بھی ایک طرح سے وحدۃ الوجود کی صورت میں ملتا ہے اور اس لیے ہندو مسلم اتحاد کے لئے یہ عقیدہ مضبوط کڑی کا کام دے سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ وہ ساری انسانیت کو ایک کر سکتے ہیں۔ تصوّف کو ہندو یوگ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی اسی اصل کی فرع ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے بابرکت خانوادہ سے اس لئے گرویدگی نہیں کہ ان کے برکات ہندوستان میں من جانب اللہ مُوید اور مشاہد ہیں بلکہ اِس لئے ہے کہ یہ ہندی نژاد خانوادہ ہے۔ اور اس کی تلقینات و ہدایات و تاویلات و تعبیرات کے اختیار کرنے سے وہ عربی اسلام، کو ہندی اسلام، بنا

سکتے ہیں، اور اس سلسلہ سے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکبر ایک ہی ہندی دینِ الٰہی کے مبلغ بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن دین کی تخریب کے لئے اس سے زیادہ بھی کوئی مہلک اور خطرناک راہ ہو سکتی ہے؟ جن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو اکبر کے ناتمام کام کا تکمیل کرنے والا بتایا جاتا ہے، اُن کا فتویٰ اکبر کے باب میں جو کچھ ہے، وہ ان کی "انفاس العارفین" کے اِس فقرہ سے ظاہر ہے:۔

"جلال الدین اکبر پادشاہ اُو را معظم و مفخم داشتے و بعد ازاں کہ بادشاہ الحاد و زندقہ گرفت، آں رشتہ الفت از ہم گسست و تنفر تمام از ہر دو جانب بظہور پیوست۔" (صفحہ ۱۶)

ایک طرف تو وطنیت کے یہ سلسلے ہیں، دوسری طرف مصطفےٰ کمال پاشا کی 'قدیم' سے علیحدگی اور یورپ کے 'جدید' معاشرت، تعلیم، خط، لباس اور تمدن وغیرہ کی پیروی کا تخیل ہے جن کو مولانا نے اپنی 'وطنیت' کے نظریہ کے ساتھ آمیز کیا ہے۔ اور اِس لیے عربی و فارسی خط کے بجائے لاطینی خط اور علماء کو کوٹ، پینٹ اور ہیٹ لگانے کا مشورہ دیتے ہیں، تیسری طرف رُوسی انقلاب کے بعض دفعات کو شاہ ولی اللہ صاحب کی 'بدور بازغہ' اور 'حجۃ اللہ' وغیرہ کی مجمل و مبہم عبارات و اشارات کے بھروسہ پر اپنے نظام میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ یہ ہے مولانا سندھیؒ کے سارے افکار و خیالات کی اساسی بنیاد جس کے ساتھ یوروپین انقلابی نظریوں کے کچھ پکے سُنے سنائے اُصول ہیں جن کو اسلامی مسائل کی چھان بین میں صرف کرتے رہے۔ العجب! مسئلہ خلق قرآن کو عربیت اور عجمیت کی نزاع بتانا کس درجہ غلط بات کا دعویٰ کرنا ہے؟ ذرا وہ اُن علماء کے نسب و نسل و وطن اور زبان پر تو نظر کر لیتے جو اس نزاع میں اِدھر یا اُدھر سے شریک تھے۔ ایک خالص دینی مسئلہ کو جو درحقیقت جیسا کہ امام ابن حنبل نے خود 'الرد علی الجھمیہ' میں اور امام بخاری نے 'خلق افعال العباد' میں لکھا ہے، اسلام اور عیسائیت کی جنگ تھی، عربیت و عجمیت کی جنگ بتانا تعجب انگیز ہے۔ پھر مسئلہ کی جو تعبیر فرمائی ہے۔ وہ معتزلہ کا مسلک نہیں، وہ تو اشاعرہ اور حنابلہ کا اختلاف ہے، جو مامون کے بہت بعد وجود میں آیا، مولانا کا یہ کہنا کہ عجمی ذہن و عقل کے لئے اللہ کی عالمگیر تعلیم کی کتاب کا صرف عربی زبان میں الہامِ قرآنی ہونا سمجھنا ناممکن ہے۔ عرض ہے کہ اگر ایسا سمجھنا محال ہے تو آریوں سے کہیں کہ وہ ویدوں کو عالمگیر دین کی کتاب نہ کہیں، اور نہ سنسکرت کو الہامی سمجھیں۔ ایک عجمی نہیں بلکہ ہندی کے ذہن کے لئے یہ ناممکن ممکن کیونکر ہو گیا، اس مقام پر مولانا کے لئے ضرور تھا کہ قرآناً عربیاً اور حکماً عربیاً کی بھی مناسب تاویل کر دیتے تاکہ قرآن پاک کے ساتھ عربیت کے وصف کا عارضی ہونا مسلمانوں (جن کو وہ "عامہ" کہہ رہے ہیں) کے نزدیک مسلم ہو سکتا۔ اسی طرح اسلامی تصوّف کو "جوگ" اور "ویدانت" سے ماخوذ

بتانا محض یورپ کی آواز کی نقالی ہے، جس کو اس کا دعویٰ ہو، اس کو چاہیے کہ ائمہ تصوف کے رسائل و مسائل کے حوالہ سے اس کو ثابت کرے۔ اگر کسی نے "جوگ" کا ایک آدھ شغل اختیار کر لیا ہو تو اس سے پورا علم اور پورا فن "جوگ" نہیں ہو جائے گا، کیا طبیبوں نے اگر بیدک کے ایک دو نسخے اپنی کتابوں میں لکھ دیئے تو اس سے پورا فن طب "بیدک" ہو جائے گا؛

مولانا سندھی کے افکار و خیالات کی بوالعجبی کا پتہ اہل دیوبند کو تو ۱۹۱۳ء ہی میں مل گیا تھا، جب وہ موتمر الانصار کی دعوت لے کر اُٹھے تھے۔ اور آخر وہ موتمر سے دست کش ہو کر دلی میں مسجد فتح پوری کے اندر نظارۃ المعارف القرآنیہ بنا کر بیٹھے۔ اور چند انگریزی و عربی کے فارغ التحصیل اور نیم فارغ التحصیل طلبہ کو قرآن کا درس دینے لگے، ان کے اس درس کا منشاء یہ تھا کہ پورے قرآن کو جبار و سیاست ثابت کیا جائے اور تمام احکام کو اس جنگی رنگ میں پیش کیا جائے، اس تغیر کی جھلک آپ کو ان کے تلامذہ مثلاً خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی کی تفسیر اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے قرآنی حواشی میں پوری طرح نظر آئے گی۔ افغانستان پہنچ کر ان کے مذہبی خیالات کے تغیر کی خبر خواص کو برابر پہنچتی رہی اور تردید کرنے والے تردید کرتے رہے اور روس و ٹرکی پہنچ کر تو ان کے خیالات کا انقلاب اوج کمال تک پہنچ گیا۔ ان کے قیام حجاز کے زمانے میں جو لوگ ہندوستان سے حجاز کو جاتے رہے اور ان سے ملتے رہے، وہ ان کے اجنبی اور بیگانہ خیالات کو سن کر جس عقیدت سے ان کی مجلس میں جاتے تھے، اُس عقیدت کے ساتھ واپس نہیں آتے تھے، ان کی ہندوستان کی واپسی کا سیاسی و مذہبی دونوں گروہوں کو انتظار تھا، لیکن افسوس جب وہ واپس آئے تو نہ تو وہ پہلے گروہ میں مقبول ہوئے اور نہ دوسرے گروہ میں —— یہ خاکسار بھی اُن لوگوں میں ہے جو ان کی ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اپنے بزرگوں کے اور ان کے تعلقات کے سبب سے ان کے ساتھ عقیدت رکھتا تھا اور مولانا بھی شفقت فرماتے تھے، لیکن جب سے "معارف" نے ان کے خیالات کی تردید میں حصہ لیا، وہ ارتباط باقی نہیں رہا۔

اَب مولانا مرحوم اُس عالم میں ہیں جہاں ان کو نہ ہماری مدح و ستائش کا کوئی فائدہ ہے اور نہ تردید و تنقید سے نقصان، اَب وہ وہاں ہیں جہاں ان پر سارے حقائق منکشف ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کا مقام اعلیٰ کرے۔

آج کل کی تمام نئی تحریکوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ ان کے بانی و مبلغ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی اصلی غایت 'اہلِ دین' کا دنیاوی فروغ، اور ظاہری شان و شکوہ اور ملکیتِ ارض ہے اور اسی لیے ان کی نظر میں دینی احکام

اور تعلیمات سیاسی واجتماعی ذرائع نظم وانتظام ہیں۔ اور یہ وہی ابلہ فریبی ہے جس میں کبھی باطنیہ اسماعیلیہ اور قرامطہ مبتلا رہے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کس نکتہ وری سے اپنی حسب ذیل عبارت[1] میں اس حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے۔

الذین هم فی الباطن من الصابئة الفلاسفة الخارجین عن حقیقة متابعة المرسلین، الذین لا یوجبون اتباع دین الاسلام، ولا یحرمون اتباع ماسواه من الادیان، بل یجعلون الملل بمنزلة المذاهب والسیاسات التی یسوغ اتباعها وان النبوة نوع من السیاسة العادلة التی وضعت لمصلحة العامة فی الدنیا فان هذا الصنف یکثرون ویظهرون اذا کثرت الجاهلیة واهلها ...... و هؤلاء لا یکذبون بالنبوة تکذیبا ببعض احوالها و یکفرون ببعض الاحوال وهم متفاوتون فیما یؤمنون به و یکفرون به من تلك الحلال فلهذا یلتبس امرهم بسبب تعظیمهم للنبوات علی کثیر من اهل الجهالات (منہاج السنۃ ـ ج ۱ ص ۳)

”درحقیقت صابیوں میں ارباب فلسفہ کا جو گروہ ہے یہ لوگ بہ باطن وہی ہیں، سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جو اصل حقیقت ہے اس کے دائرہ سے یہ باہر ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو دین اسلام کی پیروی کو ضروری نہیں خیال کرتے اور اسلام کے سوا دنیا کے دوسرے مذاہب وادیان کی اتباع کو حرام نہیں سمجھتے، بلکہ دنیا کے تمام ملل وادیان کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مختلف طریقے اور سیاسی ادارے ہیں جن میں سے جس کی بھی آدمی چاہے پیروی کرسکتا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت بھی دراصل ایک قسم کی سیاست ہی ہے لیکن ایسی سیاست جس کی بنیاد عدل اور توازن پر قائم ہے خیال ان کا یہ ہے کہ عوام کی دنیاوی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر بنانے والوں نے اسے بنالیا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی کثرت اس وقت ہوجاتی ہے اور اس زمانہ میں ان کا ظہور ہوتا ہے جب جاہلیت پھیل جاتی ہے اور جاہلیت والوں کا اقتدار قائم ہوجاتا ہے...... نبوت کی تکذیب کامل طور پر مطلقاً یہ نہیں کرتے بلکہ بعض چیزیں مانتے ہیں اور بعض چیزوں کا انکار کرتے ہیں پھر اس مسئلہ میں یعنی نبوت کی کن باتوں کو مانا جائے اور کن کا انکار کیا جائے ان کے خیالات میں باہم اختلاف بھی ہوتا ہے بوجہ نبوت

[1] فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ممنون ہوں جنہوں نے اس عبارت کا نشان لگایا ہے ان کا اصل خط معارف، دسمبر ۴۴ء میں چھپ رہا ہے۔

اور پیغمبرانہ ہدایتوں کی چونکہ یہ احترام بھی کرتے ہیں اس لیے
ان کی اصل حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔"

ابن تیمیہ کی اس عبارت کو سامنے رکھ کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ نام کتاب کے اگلے دو ابواب ہی پڑھ لئے جائیں۔

آج کل یورپ کے موجودہ سیاسی تفوق، مادی تمدن کی چمک دمک، معاشرتی آزادی، دولت کی افراط اور عسکری قیامت آفرینی نے اچھے اچھے دین داروں کے پاؤں اکھاڑ دیئے ہیں اور اس چیز کو جسے قرآن پاک نے ظاھراً من الحیٰوۃ الدنیا کہہ کر اہلِ ایمان کو اس سے بلند تر زندگی کی دعوت دی تھی۔ آج مسلمانوں کو اس سے نیچے اتار کر اسی ظاھرا من الحیٰوۃ الدنیا کی پست سطح پر قائم رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے بلکہ اسی کو اصل زندگی بتایا جارہا ہے۔ فیا اسفیٰ!

دین صرف اطاعتِ الٰہی کا نام ہے۔ اس لیے بے شبہ دین کی بلندیٔ قامت اور اس کے کلمے کے اعلاء کی راہ میں جدّوجہد اور قتال فریضۂ اُمّت ہے اور اس کے پورے شعبوں کو بروئے کار لانے کے لئے اقامتِ دین کے اس شعبہ سے بھی چارہ نہیں جس کا نام زمین کی بالآخر قوتِ آمرہ یا حکومتِ دینیہ ہے بلکہ خالص اطاعتِ الٰہی اور اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جس مومن کے دل میں مجبوریوں کے باوجود حصہ لینے کی تمنا اور آرزو یا حدیثِ نفس بھی نہ پیدا ہو وہ کمالِ ایمان سے محروم ہے۔ لیکن یہ فرض حیاتِ دنیا کی آرائش کے لیے نہیں، بلکہ حیاتِ اُخروی کے فوز و فلاح کی نیت سے ادا کیجئے مگر مولانا کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی صرف اس پر موقوف ہے کہ اس وقت بلا تامل "یورپ کے مادی اور معاشی اُصولِ زندگی کو قبول کرلیں" گو معلوم نہیں کہ یورپ کے مادی اور معاشی اُصولِ زندگی سے کیا مراد ہے؟ تفصیل بتانا چاہیئے۔

مولانا کا یہ کہنا ممکن ہے سچ ہو کہ اب خلافتِ راشدہ دنیا میں لوٹ کر نہیں آسکتی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اسلام کو مطلق حکومت نہیں، بلکہ خاص نوع کی حکومت مطلوب ہے کیونکہ اسلام میں استخلاف فی الارض ایمانِ کامل اور عملِ صالح کے ساتھ محدود ہے، اس لیے براہِ راست "استخلاف فی الارض" کی ہر دعوت غلط ہے اور ایمان کامل اور عمل صالح کی اصل دعوت دے کر اس کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض کی اُمید عین مطلوب ہے۔ پہلی دعوت کا منشا صرف متاع الحیوٰۃ الدنیا کی تلاش ہے جس کی قرآن پاک نے تحقیر کی ہے اور دوسری دعوت عین اسلام اور عین دین ہے جس کا منشا اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ کی حقیقی تفسیر اور ما ن الدنیا

خُلِقَتْ لَكُمْ وَ اَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ (دنیا تمہارے لئے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو) کی اصلی تصویر ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ مولانا سندھی جیسا عالم متبحر یورپین انقلابات اور جدید سیاسی افکار میں اُلجھ کر حجاز سے ترکستان کی راہ چل پڑا ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پر ان کے خیالات کی بھی وفات ہو جاتی مگر افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات کی ترتیب و تہذیب و اشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کر لیا ہے۔

ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کئے گئے اور ان کی دعوت پر دعوت دی گئی۔ بلکہ اس کی ترتیب و اشاعت میں بعض علماء نے بھی حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ ان کے پہلے رسالہ میں شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک کے پُورے سلسلہ کو آج کل کے لینن اور ٹراٹسکی اور اسٹالن کی شکل میں پیش کیا گیا اور ان خدا پرستوں کو دنیا پرست سیاسی پارٹیوں کے طریق دعوت کا نمائندہ بنایا گیا اور یورپ کے سیاسی پارٹیوں کے اصول کو پیش کر کے اپنے مخالف پارٹی کے عُلماء کے قتل کی تحسین[1] کی گئی۔ انا للہ!

یہ سب کچھ اس ہندوستان میں ہوا جہاں بحمد اللہ علمائے دین اور مجاہدینِ حق کی کمی نہیں۔ مگر پورے ملک میں سے صرف مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو اللہ تعالےٰ نے توفیق بخشی۔ انہوں نے مولانا سندھی کی زندگی ہی میں ان کی تردید میں پُرزور مضامین لکھے اور پوری متانت اور تحقیق اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے افکار کی تنقید کی۔ اور اب ان کے یہ متفرق نمبر ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ناقد مجیب کے اس رسالہ کو قبول اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ نصیب فرمائے۔ والسّلام

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کا سیاسی مسلک ص ۲۰۲

خطوط

(۱)

محترم المقام مکرمی مولانا مسعود عالم صاحب ——— زید مجدہٗ

سلام مسنون۔ 'معارف' کے دونوں نمبر آج ملے، ——— ہماری سیاست میں ایسے حالات پیش آتے رہے کہ ہمارا سیاسی نکتہ بدل گیا، اسے ہم نہیں چھپاتے، کاش ہمارے دوست ہم سے اسبابِ انقلاب بھی سُن سکتے۔ افسوس ہے کہ وہ معاملات ہم لکھوا نہیں سکتے۔ اس کے بعد ان کی رائے سے ہمیں شکایت نہ ہوتی ——— آپ براہِ مہربانی شیخ عبدالحق بنارسی کا ترجمہ سلسلۃ العسجد میں دیکھ لیں جو نواب صاحب نے سلسلہ اسانید سے آخر میں ذکر کیا ہے ——— ان کے اخراج کا واقعہ ایک رسالہ میں چھپا ہوا ہم نے مکہ معظمہ میں پڑھا تھا۔ وہ رسالہ مولانا احمد سعید کے خاندانی کُتب خانہ میں موجود ہے، ۱۸۵۷ء سے پہلے کا مطبوع ہے۔ شاہ عبدالغنی کی اس پر مُہر ہے، شاہ اسحاق قدس سرّہ کے فتاوے بھی اس میں درج ہیں، اور سید محمد علی رامپوری کا مختصر بیان بھی مذکور ہے۔ اگر کہیں سے مل سکے تو اُسے ضرور دیکھیے ——— ہمارا یہ فقرہ "کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک سازش" آپ غلط محل پر لے گئے۔ اس قدر بدگمانی نہ کرتے تو اچھا ہوتا ——— اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ جو مولانا حمید الدین مرحوم سے ہم نے سُنا تھا کہ ان کے اطراف کے کوئی ملازم کمپنی سرحد میں گئے۔ اور مجاہدین اور افغانوں میں نفاق کا بیج بو آئے مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ مجاہدین مع اپنے سرداروں کے شہید ہو گئے تو وہ اپنے آپ کو اُلٹا بندھواتے اور کوڑوں سے پٹواتے۔ یہ عمل وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مسلسل جاری رکھتے رہے۔

زیدیہ اثنا عشری کی طرح نہیں مگر وہ شورائی حکومت نہیں برداشت کرتے۔ امام خصوصی خاندان سے ہونا چاہیئے۔ ہمارا زمانہ اس سیاست کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ان مسائل میں اختلافِ رائے معیوب نہیں، مگر ایسی غلط فہمی نہ ہو جس کا اثر یہاں تک پہنچ جائے کہ مجاہدین کمپنی سے سازش رکھتے تھے ——— یہ ہمارا خیال ہے ———

یہ فقرہ ہم عرب انقلابیوں کے لیے تو استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کا وہ لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ ہم تو ہندی اور عربی انقلابیوں میں یہی فرق قرار دیتے ہیں کہ کمپنی عربوں کی امداد کرتی رہی۔ اور ہندیوں سے اس کا مقابلہ تھا۔
واللہ المستعان۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۳ھ ہندی عبیداللہ سندھی

---

(۲)

محترم المقام زید مجدہ سلام مسنون

آپ تنقید لکھ رہے ہیں، مبارک ہو۔ افکار اسی طرح صاف ہوتے ہیں۔ آپ کو مطالعہ میں مدد دینے کے لئے رات ایک خط لکھ چکا ہوں، وہ حضرت مولانا سید صاحب کے توسط سے آپ کو ملے گا۔ یہ دوسرا علیحدہ براہ راست لکھ رہا ہوں (۱) آپ نے مولانا ولایت علی کا مجموعہ دیکھ لیا ہے۔ غور سے مطالعہ کیجئے۔ مولانا سید صاحب (الامیر الشہید) قدس اللہ سرہٗ العزیز کو مہدی متوسط نہیں بنا رہے (۲) (الممس) میں ایک مجموعہ اربعین احادیث ہے۔ جو سرتاپا موضوع ہے۔ وہ عام لوگوں کو نہیں دکھلایا جاتا۔ پنجاب کے کسی مطبع میں چھپوایا ہے۔ اس میں ایسی حدیثیں بھی درج ہیں کہ مہدی پشاور کے شمالی کوہستان میں ملے گا۔ نواب صاحب نے اسی مجموعہ کا ذکر کیا ہے (۳) کیا سوانح احمدیہ[1] کا مصنف الامیر الشہید کو انگریزی رعایا بنا کر پیش کرتا ہے، اس سے یہ اچھا نہیں ہوگا کہ وہ اپنی تحریک کے ڈکٹیٹر تھے۔ غلطیاں ہوئیں، مگر اماموں اور ڈکٹیٹروں کی سی غلطیاں ہیں ـــــــ گرتے ہیں شاہ سوار ہی میدان جنگ میں ـــــــ آپ مجھے ایسا خیال کریں کہ دنیا کے لادینی ڈکٹیٹروں کے مقابلہ میں آنا چاہتا ہوں یا متدین نوجوانوں کو ان کے مقابلہ کی ہمت افزائی کرتا ہوں۔ ہمارے متدین نوجوان کس راستہ سے آگے بڑھیں۔ وہ راستہ بتاتا ہوں۔ عزیزیں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ غلطیوں پر متنبہ کریں۔ فوراً اصلاح کروں گا۔ مگر خدا کے لئے جمود چھوڑیں۔ آگے بڑھیں ـــــــ میرا تجربہ ہے ہم اگر دلی کے بادشاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں، تو کابل، قسطنطنیہ وغیرہ ممالک میں کہیں بار نہیں پاتے۔ یہ بادشاہ ہمارے ہیں، ان کے غلط کاروں کی غلطیاں پکڑنا ہمارا فرض ہے ـــــــ اپنے گھر میں پاؤں ٹکانے کے لئے جگہ نکالئے، پھر مسلمانوں سے ملنے، ان سے سیکھئے، اگر کوئی مفید بات آپ نے

---

[1] سوانح احمدی کا مصنف الامیر کا تعلق امام عبدالعزیز سے کاٹنا چاہتا ہے غور سے مطالعہ کیجئے۔ چالاک مصنف غیر مسلم ہیں ان کی کتابیں یا ان کے اقتباس عربی رسالوں میں پڑھ چکا ہوں مکہ معظمہ کے دوران قیام میں۔ فقط

بزرگوں سے محفوظ کرلی ہے، تو دنیا کو تعارف کرایئے۔

کیا آج یوروپین مفکرین کے مقابلہ میں آپ اپنا مفکر پیش کرسکتے ہیں، کیا ان ڈکٹیٹروں کی دنیا میں آپ اپنا ڈکٹیٹر اپنے لئے امام بناکر آگے بڑھ سکتے ہیں ——— خدا کرے کہ آپ کی تنقید مجھے ہمت دلائے کہ صحیح بات زیادہ صاف لفظوں میں لکھ سکوں۔ اللہ رب العزۃ ہم پر رحم کرے۔ کاش ہم کبھی مل بیٹھتے اور تدریجی انقلاب کی سیڑھیاں جس طرح ہم نے طے کی ہیں، آپ کو ان کا پتہ نشان تبلاتے۔ فیصلہ آپ کا وہی زیادہ صحیح ہوگا جس میں ہر قسم کے معلومات سامنے آجائیں۔

عربک کالج کی اسکیم ذاتی مطالعہ کے لیے بھیجتا ہوں۔ والسلام

۲۶ مارچ ۱۹۴۳ء لوہندی　　　دارالرشاد　　　عبیداللہ سندھی

(۳)

مکرمی المحترم۔ سلام مسنون۔ کل اپریل کا معارف ملا۔ اس سے پہلے ایک پمفلٹ "البرھان" کو بھیج چکا ہوں جس میں بعض مجلات کی قدرے تفصیل ہے۔ اس میں حضرت سید صاحب کے مشورے کا بھی خیال رہا ہے، مگر بیمار ہوں اور کوئی کتاب بھی پاس نہیں، اس لئے مختصر یادداشت کے طور پر لکھنا پڑا ——— اجماع کی تفسیر میں آپ ازالۃ الخفاء میں مذہب عمر کا رسالہ بلکہ اس رسالہ کا مقدمہ دو صفحے ضرور دیکھ لیں ——— امام شوکانی زیدی امیر یا امام کے قاضی رہے ہیں۔ ایک امیر کے وفات پر اس کے جانشین امام سے پہلے خود بعیت کی اور پھر عوام سے امام کے نام پر بعیت لینے کا واسطہ بنے۔ کیا کوئی غیر زیدی یہ وظیفہ ادا کرسکتا ہے۔ ہمارا مطلب اس بحث سے امام شوکانی کی توہین نہیں جیسا کہ سمجھا جاسکتا ہے بلکہ ہم نے ایک ایسا طائفہ دیکھا جو حنفیہ کو مشرکین کے درجہ پر مانتا ہے۔ اور ہم ان کے ساتھ مداراۃ پر مجبور ہیں۔ انہیں لوگوں کو اپنی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے ہم نے زیدیت کی بحث چھیڑی تھی۔ کیا حنفیت زیدیت سے بھی زیادہ قابلِ انکار ہے ——— زیدیہ میں سے ایک محقق اہل السنۃ کے لیے قابلِ تقلید مل سکتا ہے تو دیوبندی حنفیہ میں کیوں اس قسم کے عالم متبنٰی نہیں کئے جاتے۔ یہ واقعات مکہ معظمہ میں پیش آئے اور ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اس مخمصہ سے ہمیں نجات ملی ورنہ وہ لوگ ہمارے اخراج کی تدبیریں سوچ رہے تھے ——— ہمارا یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہم اپنے سیاسی انہماک کے غلبہ میں

اسلامی فرقوں کی امتیازی چیزوں پر غور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن واقعات کی مجبوری سے بقدرِ ضرورت حصہ لینا پڑا —— اب ہند میں معاملہ بالکل ہی صورت میں پیش ہو رہا ہے۔ گاندھی ازم کے مقابلہ میں ہمیں ایک فلاسفر پیش کرنا ضروری ہے۔ کیا ڈاکٹر اقبال کافی ہے۔ ڈاکٹر نتشے کو مانتا ہے تو علامہ مشرقی ڈارون کو، میں گاندھی کے متبعین کے ڈر سے ان حضرات پر جرح بھی نہیں کرنا چاہتا مگر ان کی تقلید بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے اپنے لیے مخلص امام ولی اللہ کی فلاسفی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، —— اسے آہستہ آہستہ پیش کر رہا ہوں۔

کیا امام ولی اللہ سیاسی متبوع بھی ہیں یا ان کی محض فکری بلند پروازی تھی۔ میں اپنے دیوبندی اساتید کی بنیاد پر ان کے سیاسی متبعین کا تسلسل قائم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بیماری اور پریشان حالی سے غلطیاں بھی صادر ہوتی رہیں گی۔ حسب الامکان اصلاح کرتا رہوں گا۔ ورنہ اُمید رکھتا ہوں کہ معاف کر دیا جاؤں گا۔

آپ فراخدلی سے تنقید کریں —— ہم آپ کی جماعت سے علیحدگی اس لیے اختیار کرتے ہیں، کہ ہمارے اغلاط کی ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد نہ ہو۔ میں تو اس قدر کمزور ہو چکا ہوں کہ جنہیں میں اپنا سمجھتا ہوں وہ بھی منہ نہیں لگاتے۔ اِس لیے ؎

اوروں پہ کیوں نزول بلا اپنے ساتھ ہو	اب ہم مکان شہر سے باہر بنائیں گے

کا معاملہ ہے۔

والسّلام

۲۲، اپریل ۱۹۴۳ء بیت الحکمۃ۔ دار الرشاد عبید اللہ سندھی

۴

مکرمی ، سلام مسنون۔ آپ کا کارڈ ملا۔ میرے خطوط پرائیویٹ ہیں۔ محض آپ کو مطالعہ کے لئے متوجہ کرنا منظور ہے۔ رائے بدلنے کی کوشش یا پبلک میں مرافعہ منظور نہیں، اگر خدا کو منظور ہے۔ اور ہم کبھی مل بیٹھے تو بہت سے معاملات پر مذاکرات کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں بیمار ہوں، زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔

والسّلام

تمام رُفقاء محترم سلام مسنون قبول فرمائیں۔

۲۳، مئی سنہ ۱۹۴۳ ہندی دار الرشاد۔ گوٹھ پیر جھنڈا

(۵)

مکرمی المحترم زیدہ مجدہ ——— سلام مسنون ۔ آج معارف دیکھا ۔ کل "برہان" دیکھ چکا تھا۔ آپ کو وحدۃ الوجود کا مسئلہ سمجھنے میں لمبے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو کتابوں سے نشانہ ہی کر کے توسیع مطالعہ کے لیے راستہ بنانے میں مدد دوں گا۔ ہم نے امام ولی اللہ کی حکمت کے تعارف میں کچھ اشارات لکھے ہیں، بالفعل ان پر توجہ فرمائیے۔

آپ کو شبہ ہے کہ میں نجد، یمن اور زیدیت اور تشیع میں شاید اچھی طرح فرق نہیں کر سکتا ——— میں بارہ سال عرب میں رہا ہوں۔ یمن اور نجد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے ملک میں نواب صاحب کے اعوان یمن سے تعلق رکھتے ہیں اور میاں صاحب کے شاگردوں میں غزنوی (امرت سری) خاندان نجد سے وابستہ ہے۔ یہ دونوں مرکز امام ولی اللہ کو مانتے ہوئے ائمہ یمن اور نجد کو ان پر ترجیح دیتے ہیں ——— کمپنی بہادر کے زمانہ میں یمن کے شیعہ علماء آتے رہے، وہ اپنے ادبی کمالات سے ہند کو متاثر کرتے رہے اور امام ولی اللہ کے فکر کے سخت مخالف تھے۔ اس کے بعد نواب صدیق حسن سے قدرے پہلے مولوی عبدالحق ہند میں ایک مرکزیت کے مالک بن جاتے ہیں اور وہ زیدی ہیں امام ولی اللہ کے فکر سے ہٹاتے ہیں۔ پھر نواب صاحب نے قاضی شوکانی سے اتصال پیدا کیا۔ امام ولی اللہ کے مسلک سے مخالف دعوت شروع کر دی۔ براہِ مہربانی ان معمولی مولا کو اہمیت نہ دیا کریں۔

مولانا شہید کو امام ولی اللہ سے علیحدہ فرض کرنے کی غلطی سے پرہیز کریں۔ مولانا شہید کی کتابوں کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔

آپ کا کارڈ مؤرخہ ۶ رمئی ملا۔ شکریہ! یہ خط و کتابت محض دوستانہ ہے اور پرائیویٹ۔ والسلام

۱۴ اگست ۱۹۴۴ء ہندی گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ

(۶)

بجناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی دام عنایتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اس وقت بستر علالت پر ہیں۔ چند دن تک ان کی حالت نہایت تشویشناک رہنے کے بعد اب پھر اللہ کے فضل سے رو بصحت ہے۔ کل آں ممدوح نے آپ کا "استدراک" جو آپ نے ان کی تاریخ تحریک ولی اللہ محدث دہلوی پر ماہ فروری

تا مئی ۱۹۴۳ء ہندی میں "معارف" میں شائع کرایا تھا، پڑھوا کر سُنا۔ اور آج مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حضرت مولانا کی طرف سے تحریر کروں کہ "ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی دعوت کو اسلام میں اوّل درجے کی چیز مانتے ہیں، ان کے بعد امام ولی اللہ کی تحریک کو دوسرے درجے کی دعوت کا مقام دیتے ہیں" —— آج کل ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس کے متعلق ہم نے اطمینان کے ساتھ امام ولی اللہ کی تابعداری میں اپنا پروگریم (PROGRAMME) بنا لیا ہے۔ اب ہم اس میں کسی دوسرے پروگریم (PROGRAMME) کو تداخل کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ براہِ مہربانی ہمیں معاف فرمائیں۔

فقط والسّلام

المخلص، بشیر احمد۔ بی۔ اے

معتمد خصوصی حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

کتاب اوّل

سابقہ نام

"شاہ ولی اللہؒ اور اُن کی سیاسی تحریک"

استدراک و تنقیح

نیا نام

صادقینِ صادق پور اور عُلمائے اہلحدیث

مولانا سِندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ

صادقینِ صادق پور اور علمائے اہل حدیث

مولانا سندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ

دنیا میں مظلومیتوں کی داستان بار بار دُہرائی گئی ہے، تاریخ میں میدان جنگ کے ابتلاء کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں بعض اکابرِ اُمت کی مظلومیت میدانِ شہادت کی مظلومیت پر بھی بازی لے گئی ہے۔ اور زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس خون کی چھینٹیں ان کے ماننے والوں اور نام برداروں کے دامن پر بھی ہیں۔

جہاں تک تاریخی واقعات و حقائق کا تعلق ہے، یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرت سید احمد بریلوی (۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء، ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور ان کے اصحاب سے پہلے اس خطۂ ارض میں کسی صحیح دینی تجدید و انقلاب کے لئے کوئی منظم اور ہمہ گیر کوشش نہیں کی گئی اور ہندوستان تو ہندوستان ساری دنیا میں عہدِ صحابہؓ کے بعد کوئی جماعت طریقِ نبوت اور اُسوۂ نبوی سے اتنی قریب اور ہم آہنگ نظر نہیں آئی، لیکن حالات اور ماحول کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غیر تو غیر اپنوں میں بھی سید صاحبؒ اور اُن کے مخصوص احباب کا فکرِ بلند، معتدل مزاج و مشرب اور مسلک و عمل میں عجیب و غریب توازن پُورے طور پر نہیں سمجھا گیا۔ ہر فریق نے اپنے ظن و تخمین کے مطابق اُنہیں اپنانے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کھینچا تانی میں وہ "فکرِ بلند" تو آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، اور اُن کے ماننے والوں اور پیروی کا دَم بھرنے والوں میں تقلید و عدمِ تقلید، آمین، رفع یدین، دیہاتوں میں نمازِ جمعہ اور اسی قسم کے چند فروعی مسئلے لڑنے جھگڑنے کے لئے رہ گئے، آغاز کیا تھا، انجام کیا ہوا۔ دیدۂ عبرت وا ہو، تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

ہماری بدبختی یہیں ختم نہیں ہوتی، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی[1] (ف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۷۲ء) سے

---

[1] مولوی فضل رسول صاحب نے ہندوستان میں سب سے پہلے وہابی کی اصطلاح استعمال کی (ترجمان وہابیہ ص۸ رسالہ اشاعۃ السُّنۃ ۱۳۰۰ھ ص ۲۱۲) نجد و ہندوستان کے موحدین و مجاہدین پر رنگ برنگ کے الزامات دھرنے میں یہ پیش پیش رہے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ[2] کے "تذکرہ" میں ان کا ذکر بڑے دلچسپ طریقے پر آیا

(باقی حاشیہ ص۳۹ پر)

[2] کتاب کے پہلے ایڈیشن کے وقت مولانا آزاد مرحوم زندہ تھے (ناشر)

سے کر ولیم ولسن ہنٹر[2] (W. W. HUNTER) راونشا[3] (T. E. RAVENSHAW) اور جیمس اوکنلے[4] (JAMES OKINLEY) تک کی دشنام طرازیاں برداشت کی جا سکتی ہیں، کہ ان سے کلمۂ خیر کی توقع ہی کب تھی؟ مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحابِ فکر ان نفوسِ قدسیہ کے منہ آئیں۔ ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں۔ اُن کے ضرب المثل اخلاص پر شک کریں تو پھر خواہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی، کہیں بے ادبی نہ شمار کی جائے۔ عرضِ مدّعا سے روکتا ہے، دوسری طرف احساسِ فرض اور یہ خوف کہ اگر سکوت سے کام لے کر غلطیوں کی تصحیح نہ کی گئی، تو کہیں بزرگوں کی یہ لغزشیں آگے چل کر تاریخی حقائق نہ بن جائیں، اظہارِ مطلب پر اکساتا ہے، یوں تو مروّت اور صداقت

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے۔ چند سطریں نذرِ ناظرین ہیں: "مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمٰن میں لکھتے ہیں: "داؤد ظاہری شیطان کا تبع تھا اس کے بعد ابن حزم ظاہری پیدا ہوا، جو خبیث تھا، پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا۔ اور ابن قیم کا شاگرد "شقی" ابن تیمیہ، ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا۔ "بعض اشرار بد اطوار جیلہ فسقہ در حلقۂ انقیادش آمدہ در بلادِ اسلامیہ طرفہ ہنگامہ برپا نمودند" اور ان تمام مورخانہ تحقیقات کے لئے آخر میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ الخ الخ (تذکرہ صفحہ ۲۶۶ (ص ۹۶)۔ "سوط الرحمٰن" کا اصل نام "البوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ" ہے، ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی ہے۔ مولانا آزاد نے جو اقتباس دیا ہے وہ در اصل مسلسل مصنف کی عبارت نہیں ہے بلکہ یہ کتاب مذکور کے ص ۲۳، ص ۲۵ پر ائمہ مذکورین کے خلاف یہ دریدہ دہنی کی گئی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ (ناشر)]

[2] ہنٹر صاحب جماعتِ مجاہدین کے خاص کرم فرما ہیں۔ ان کی کتاب مسلمانانِ ہند (OUR INDIAN MUSALMANS) مشہور ہے، مولوی طفیل احمد صاحب کی کتابوں (حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں اس کے کافی اقتباسات ہیں۔

[3] راونشا ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ پٹنہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری (ف ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۱ء) کے مقدمے کی ابتدائی سماعت اسی نے کی تھی۔ اس کا فیصلہ اور میمورنڈم ہفوات و خرافات کا مجموعہ ہے۔ ہنٹر کی کتاب کا ایک حصہ اسی میمورنڈم سے ماخوذ ہے۔

[4] اوکنلے صاحب بھی مجاہدین کے پرانے مشفق ہیں۔ سازش کے آخری مقدمے (۱۸۷۰ء مقدمہ پٹنہ بنام امیر خاں، حشمداد خاں ابراہیم منڈل وغیرہم) میں یہ سرکار کی طرف سے پیروکار تھے، بلا کشانِ الم کی پریشانیوں میں ان کا بھی کافی دخل رہا ہے۔

کی کش مکش ہمیشہ صبر آزما ہوا کی ہے۔ لیکن راقم کے لئے اس تحریر کے سلسلے میں یہ کش مکش بہت طویل اور تکلیف دہ رہی، آخر دو تین مہینوں کی ذہنی اُلجھن کے بعد دل و دماغ نے اظہارِ مطلب ہی کے حق میں فیصلہ دیا اور زبانِ قلم نے بسم اللہ کہہ کر استدراک کی بسم اللہ کی۔

جناب مولانا عبید اللہ سندھی کی زیرِ نظر کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" "حزب امام ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ" کا مقدمہ ہے، اصل مقدمہ کے آغاز سے پہلے "اجمالی فہرست" میں مضامین کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ جس کا لب لباب اصل کے جملوں کو مقدور بھر محفوظ رکھتے ہوئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ تفصیل میں پڑنے سے پہلے مقدمہ کا اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔

مولانا سندھی کے مفروضات کا خلاصہ اور خاکہ

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ (۵ مئی ۱۷۳۱ء)[1] سے دہلی کے مفاسد کو ختم کرنے کے لئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

تاریخِ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلاب فرانس سے ۵۰ سال پہلے ہو گذرا ہے۔

حکیم الہند نے اپنا نصب العین معین کیا۔ جمعیۃ مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلیں، اس طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس نے حکومت موقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) بنائی، لیکن ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء)[2] (بروز جمعہ) بالاکوٹ کے معرکۂ شہادت کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس صدی میں اس تحریک کے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی۔

(الف) امام ولی اللہ دہلوی ۱۷۳۱ء۔ ۱۷۶۳ء،

(ب) امام عبد العزیز دہلوی ۱۷۶۳ء۔ ۱۸۲۴ء،

---

[1] ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ۔ ۵ مئی ۱۷۳۲ء کے مطابق ہوتی ہے۔ ۱۷۳۱ء صحیح نہیں۔

[2] ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ، ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ ہے نہ کہ ۲۷ ذوالقعدہ۔ ۹ مئی دوشنبہ ہوگی۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ سید صاحب کی شہادت ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو ہوئی ہے (سیرت سید احمد شہید، صفحہ ۲۲۶، ج ۱)

(ج) امام محمد اسحاق دہلوی سنہ ۱۸۲۴ء۔ سنہ ۱۸۴۶ء۔

(د) حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد سنہ ۱۸۲۶ء۔ سنہ ۱۸۳۱ء۔

یہ تحریک کا پہلا دور تھا۔

دوسرا دور امام محمد اسحٰق نے سنہ ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ سنہ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور سنہ ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی، ان کے بعد الامیر امداد اللہ بارہ برس دہلی میں رہے۔ یعنی سنہ ۱۸۵۸ء تک، اس کے بعد مکہ معظمہ میں۔

ان کے پہلے نائب یعنی مولانا محمد قاسم سنہ ۱۸۷۹ء تک، پھر مولانا رشید احمد سنہ ۱۹۰۵ء تک شیخ الہند مولانا محمود حسن سنہ ۱۹۲۰ء تک[1] اس سال تحریک کا دوسرا دور ختم ہوا، تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے سنہ ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا: (ص ۱۰-۹)

مذکورہ مفروضوں کا اجمالی تجزیہ

یہ ہے حزب ولی اللہ کی اجمالی تاریخ کے مقدمہ کا خاکہ، جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کو بالکل ضمنی حیثیت دی گئی ہے، اور ان کے خاص ماننے والوں اور سالہا سال تک علم جہاد بلند کرنے والوں کے لئے تو اس خاکے میں کوئی گنجائش ہی نہیں، اسلامی ہند کی پہلی اور (اب تک) آخری تحریکِ تجدید و انقلاب میں سید صاحبؒ کو ضمنی حیثیت دینا، حقیقت و صداقت کا خون کرنا ہے، سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی نے اس باب میں سید شہیدؒ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے۔ اور پھر امیر شہیدؒ (مولانا کی اصطلاح کے مطابق) کی اس "ضمنی حیثیت" کو بجا ثابت کرنے کے لئے اُن کی طرف طرح طرح کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں، تحریک کے دوسرے دور میں مولانا محمد اسحٰق سے مولانا محمود الحسنؒ تک مختلف افراد کی مسلسل امارت و امامت ثابت کرنے کے لئے سید شہیدؒ کے جان نثاروں، پورب کے سرفروش مجاہدوں اور شہیدوں، سرکار انگریزی کے ممنونِ التفات اہلِ صادق پور[2]، بدنام وہابیوں اور عام جماعت اہلِ حدیث

---

[1] اس فہرست میں صرف عیسوی سنہ (سنین) دیئے گئے ہیں۔

[2] صادق پور، شہر عظیم آباد پٹنہ کا ایک محلہ ہے، یہاں کا ایک ہاشمی خاندان عرصہ دراز سے علم و فضل میں ممتاز رہا ہے۔

(باقی حاشیہ ص پر)

کو زیدیت، شیعیت، رفض اور مختلف القاب سے اس بے دردی کے ساتھ نوازا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک وسیع النظر عالم اور ممتاز صاحبِ فکر کے قلم سے ایسی لغزش کیونکر ہوئی؟ اور اسی لپیٹ میں یمن کے سلفی عالم و محدث قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) اور نجد کے مظلوم مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) اور اُن کے متبعین بھی آ گئے ہیں، زیرِ تحریر اشاعت کا مقصد انہی مظالم کا مداوا کرنا ہے۔

حکمتِ ولی اللٰہی کی خود ساختہ تشریح

یوں تو راقم کو حزبِ ولی اللٰہی کی نئی تفسیر و تشریح سے بھی اتفاق نہیں، کتاب و سنت کے علاوہ کسی امام یا حکیم کے مرتب کردہ فلسفہ و حکمت کو دعوت کی اساس بنانا اسلامی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں، خواہ اس مخصوص فلسفہ و حکمت کے اجزائے ترکیبی تعلیماتِ ربانی ہی سے کیوں نہ ماخوذ ہوں؟ تجدید کا بلاوا صرف قرآن کریم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہونا چاہیئے۔ ورنہ اشخاص و افراد کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب علمِ جہاد بلند کیا تو اس خاندان کے ایک ممتاز فرد مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) لبیک کہنے والوں کی صفِ اول میں تھے اور پھر اُن کی تبلیغ سے پورا خاندان سید صاحبؒ اور اُن کی دعوت کا علم بردار ہو گیا۔ اور اس سلسلے میں ان لوگوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا ؎

هرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) سے لے کر ۱۸۶۱ء تک حکومت کی داروگیر کے باوجود مسلسل چالیس سال تک صادق پور والوں نے جہاد کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ پھانسی، جلاوطنی، حبسِ دوام، ضبطی اور ہر قسم کی ممکن اذیتیں انہیں دی گئیں، لیکن یہ اللہ کے بندے راہِ حق سے نہ ہٹے۔ بڑی دردانگیز اور ولولہ خیز داستان ہے، کبھی اطمینان سے سنائی جائے گی۔ سیرت سید احمد شہید (ص ۲۰۲-۲۰۵ طبع دوم) کے چوتھے باب میں بھی اس جماعت کی مختصر سرگذشت آ گئی ہے، خاندانی حالات کے لئے مولانا عبدالرحیم صادق پوری اسیر پورٹ بلیر و متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء (ف ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء) کی "تذکرۂ صادقہ" ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جماعت کے کاموں کے متعلق بھی اس میں بکھرے ہوئے لیکن قیمتی معلومات ملتے ہیں۔

نام پر جو تحریک بھی اٹھائی جائے گی۔ اس کا کتاب وسنت کے صراطِ مستقیم سے ہٹ جانا ضروری ہے اور اگر وہ تحریک اس گھاٹی سے بھی صحیح وسالم بچ نکلی۔ تو کم سے کم ایک نئے فرقے کا ظہور یقینی ہے، جو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل فتنہ ہے۔

اکبر کے "دینِ الٰہی" اور "نیشنلزم" کی حمایت

یہ تو ایک اصولی بات تھی ورنہ مولانا سندھی کی تفسیر کے مطابق حزب ولی اللہ اور حکمت ولی اللّٰہی کے خمیر میں وقت کی بعض مقبول لیکن بر خود غلط تحریکوں کے جراثیم صاف نظر آتے ہیں، اکبر کے رسوائے عالم "دینِ الٰہی" کی مدح سرائی[1] (ص ۱۰۴) اور ابلیس کی بیٹی "نیشنلزم" کا رجز میخانۂ مغرب کا فیض نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر یہ کیا بات ہے کہ شیخ الہند کا شاگرد ہندوستان چھوڑتے وقت تو اتحادِ اسلامی کا حامی تھا اور واپسی کے بعد وہ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر کرتا ہے۔

"جب ہم ہندوستان سے نکلے تھے تو اتحادِ اسلام کے حامی تھے۔ یعنی انٹرنیشنل پروگرام رکھتے تھے مگر جب ہم واپس آئے تو اس وقت خالص نیشنلسٹ ہیں، یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا ہے۔" (ص ۱۶۶)

---

[1] اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، حکومت چلانے کے لئے بادشاہ اور اس کی انتظامی کونسل کا کیا طرزِ عمل ہوگا؟ اس کے لئے اکبر نے "دینِ الٰہی" کا فقرہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کی مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرفدار نہیں ہوں گے مگر مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے کو آزاد نہیں کریں گے۔ اور لادینیت نہیں آنے پائے گی (ص۷)۔ کیا دینِ الٰہی کے متعلق یہ بیان تاریخی طور پر صحیح ہے! مزید تفسیر ملاحظہ ہو۔

"ہماری رائے میں اکبر نے جو کام شروع کیا تھا وہ اساساً صحیح تھا اور عملاً غلطیاں اس لئے ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے آدمی میسر نہیں آتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتیں خدا تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعے پوری کردیں شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کر دیا جو اکبر نے شروع کیا تھا کیونکہ وہ بھی اسلام کو انسانیت کی تعبیر بتاتے ہیں آپ تمام ادیان کو منطبق کر سکتے ہیں، ان کے طریقے پر ایک مسلم عالم اس نظامِ سلطنت کو چلا سکتا ہے جو اکبر کا مقصد تھا۔" الخ (ص ۱۰۵)

کیا اس کے بعد کسی رائے زنی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

اللہ رے انقلابِ حال!! امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا شارح و مبلغ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

اس جملہ معترضہ سے یہ حقیقت ظاہر کرنا تھی کہ گو اس "استدراک" میں ہمارا روئے سخن زیادہ تر ان غلط بیانیوں کی طرف رہے گا جو حضرت سید احمد شہیدؒ، ان کے متبعین اور مجددین کے دوسرے اکابر امت کے متعلق کی گئی ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حکمتِ ولی اللہ کی اس تشریح و تفسیر سے بھی ہمیں اتفاق ہے جس کی تبلیغ اس کتاب میں کی گئی ہے۔ اور جس میں روس اور ترکی کے نمونے پر ایک نظامِ عمل "شاہ صاحب کا اجمالی پروگرام" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ (صنہ ۳-۲۵)

شاہ ولی اللہؒ نے کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی تھی

مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حزب ولی اللہ کے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی۔ شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ محمد اسحٰق کو وہ ائمہ میں شمار کرتے ہیں، اور حضرت سید احمد شہید کو حکومت موقتہ کے امیر کا درجہ دیتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ واقعات اس "بیان" کا ساتھ نہیں دیتے، پہلے تو یہ بسم اللہ ہی محلِ نظر ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے کوئی سیاسی پارٹی بنائی تھی، تصنیفات میں وقت کے حالات اور ملکی مصالح کے متعلق اشارات کا ملنا اور بات ہے اور کسی سیاسی پارٹی کی تشکیل بالکل دوسری چیز ہے، جہاں تک پتہ چلتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اصلاح و تجدید کی نشان دہی اور صرف فکری تشکیل کی تھی، ان کے بنائے ہوئے خاکے کی تکمیل عملی جد وجہد اور سر فروشانہ اقدام کا رتبہ بلند تکیہ رائے بریلی کے سید زادے اور خود ان کے پوتے کے لئے مقدر ہو چکا تھا (اللہ بالاکوٹ کی سرزمین پر اپنی رحمت کے پھول برسائے کہ وہاں ناموسِ ملت خواب میں ہے) بہر حال اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مولانا کی ہمنوائی میں حزب ولی اللہ کی تشکیل اور اس کی تمام تفصیلات کو تسلیم کر لیں تو ہمیں پچھلی ڈیڑھ صدی کی تاریخ از سرِ نو لکھنا پڑے گی اس لیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کی امامت اور مرکزی حیثیت قبول کرنے میں تو کوئی دقت نہیں لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کو حزب کا امام اور سید شہید کو ان کا ماتحت اور امیر بنا کر پیش کرنا حق و صداقت سے کھیلنا ہے تاریخ جب آپ کے منشا کے مطابق نہیں بنی تو اب تاریخی حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے خیالات کا تابع بنانے کی کوشش کرنا بے سود ہے اور مولانا سندھی کی یہی بنیادی مسامحت ہے جس نے اس "تاریخی مقدمہ" کو مفروضات اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ بنا دیا ہے

—— ۱ ——

سیّد احمد شہیدؒ کے متعلّق مغالطات کا ازالہ

اب آیئے اصل موضوع کی طرف متوجّہ ہوں۔ فاضل مُصنّف نے حضرت سیّد شہیدؒ کی امامت و امارت پر جو اعتراضات کئے ہیں، اُن پر نظر ڈالنے سے پہلے مصنّف کے اعترافِ فضل کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک ان کے مقاصد سے تعارض نہیں ہوتا۔ وہ سیّد شہید کے کمالات کے اعتراف میں رطبُ اللسان ہیں۔

”حضرت سیّد احمد بریلوی جو ان کے مدرسے کے شاگرد تھے، مگر قوتِ کشفی میں اپنے زمانے کے عارفین بلکہ بہت سے مُتقدّمین پر بھی سبقت لے گئے تھے۔ ان کی تربیت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادر کی صحبت میں مکمّل ہوئی۔“ (ص۴۷)

یہاں عاجز صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ سیّد صاحب کو اس گھر سے صرف تلمّذ ہی نہ تھا بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت بھی حاصل تھی، (سیرت سیّد احمد شہید، طبع دوم ص۵۵)

اب اس ”اعتراف کے بعد“ مدح و ذم“ کی آمیزش ملاحظہ ہو۔

”شاہ عبدالعزیزؒ کا پروگرام ہی تھا کہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بُلایا جائے۔ . . . . اس کے لئے وہاں ایک امارت قائم کرنے کی ضرورت ہوگی اور افغانوں میں ایک سید کی امارت بہت جلد مقبول ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے سیّد صاحب کو امیر مقرر کیا گیا۔ اور مولانا شہیدؒ اور مولانا عبدالحی کو ان کا وزیر بنا کر ساتھ کر دیا گیا۔“ (ص۷۵)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ”سیّد زادگی“ کے سوا سیّد صاحبؒ میں اور کوئی خاص بات نہیں تھی، مگر اس پر بھی مولانا کو اطمینان نہیں، دنیا تو یہی جانتی ہے کہ پنجاب و سرحد میں احیائے جہاد کی ساری کوششیں سیّد صاحب ہی کی دعوت اور جدّ وجہد کا نتیجہ تھیں، اس سے آگے بڑھ کر ذرا صاف الفاظ میں فرماتے ہیں۔

”سیّد صاحب اور مولانا شہیدؒ اور مولانا عبدالحیی اس انقلابی پروپیگنڈے کے مرکز بنائے گئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے شاہ اسحٰق کو اپنی جگہ مقرر کیا، ہماری سمجھ میں اس نئے حزب کے امیر شاہ اسحٰق تھے، سیّد صاحب فقط امیرالدعوت والجہاد تھے، اور یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دُور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی

ہے۔ اس کو ایک حکومتِ موقتہ کا درجہ دینا چاہیئے" (ص‌ٖ)

غلطی ہائے مضامین

ان تین سطروں میں متعدد ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں۔

(الف) شاہ عبدالعزیزؒ نے شاہ اسحٰق کو کب مقرر کیا؟ یہ بیان محتاجِ ثبوت ہے اور اس کے لئے مستند تاریخی شہادت کی ضرورت ہے۔

(ب) سید صاحبؒ کو فقط امیر الدعوۃ والجہاد کہنا بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سید صاحبؒ اور اُن کے رُفقاء کر رہے تھے، جن میں مولانا عبدالحیٌ اور مولانا شہیدؒ "شیخین" کا درجہ رکھتے ہیں اور فوری طور پر ان کے سامنے اصلاحِ رسُوم و بدعات کے علاوہ پنجاب میں سکھوں سے جہاد کرنا تھا۔ گو ان کے مقاصد بہت بلند تھے۔

(ج) یہ کہنا کہ "یہ جماعت سلطنتِ دہلی کی کمزوری دُور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی ہے" سید صاحبؒ اور ان کے اعلیٰ مقاصد کی تنقیص ہے۔ سید صاحب خالص اسلامی نظام چاہتے تھے، خلافتِ راشدہ کے نمونے پر حکومتِ الٰہی کی تاسیس ان کا مقصد تھا۔ دہلی کی سلطنت کبھی اسلامی سلطنت نہیں رہی۔ سید صاحبؒ کا نصب العین اور مقصد اس قدر واضح ہیں کہ ان میں کسی شک و شُبہ کی گنجائش ہی نہیں، جہاد کا ارادہ بھی کسی حزب کی تاسیس و تشکیل سے شروع نہیں ہوا۔ رامپور میں ولایتیوں سے مسلمانانِ پنجاب کی دردانگیز حالت سُنی اور نیت اسی وقت مستحکم ہو گئی (سوانح احمدی ص۲۴) رہا جہاد و ہجرت اور نصب امامت کا مقصدِ عالی تو اُسے خود انہی کی زبان سے سُنیئے، سردار سُلطان محمد خاں اور سردار سعید محمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:۔

ربِ غیور کہ علیم بذات الصدور است	"ربِ غیور جو کہ دل کے حال سے اچھی طرح
آگاہ است بر ایں معنی کہ ایں جانب	آگاہ ہے، اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے
را از قبول ایں منصب غیر از اقامت	کہ میری اس منصب (امامت) کے قبول
جہاد بر وجہ مشروع و حصول معنی انتظام	کرنے سے اس کے سوا کوئی دوسری نفسانی
در عساکر اہلِ اسلام غرض دیگر از اغراض نفسانیہ	غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا
نیست .... آرے ایں قدر	جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو.....

آرزو دارم کہ در اکثر افرادِ بنی آدم بلکہ در جمیع اقطارِ عالم احکام رب العالمین کہ مسمی بشرع متین است بلا منازعت احدے نافذ گردد۔ ...۔ [1] (سیرت سید احمد شہید ص ۱۱۰)

ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العالمین کے احکام جن کا نام شرع متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں .. ..

ہمیں کوئی بتائے کہ دہلی کی حکومت کو کسی دور میں اس مقصدِ عالی سے کوئی دور کا تعلق بھی رہا ہے ؟

لَشَتَّانَ مَا بَيْنَ الْيَزِيدَيْنِ فِي النَّدَىٰ ‫ ‫ يَزِيدِ سُلَيْمٍ وَالْأَغَرِّ بْنِ حَاتِمِ

سید صاحبؒ کو ایک ضمنی حیثیت دے دینا تو آسان ہے، لیکن واقعات کی تکذیب بہت مشکل ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد مولانا عبدالحیی بڈھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) اور بھتیجے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) جن میں سے ہر ایک کا مرتبہ خاندانِ ولی اللّٰہی میں مسلّم ہے، سید صاحب کے جان نثاروں میں شامل تھے، خدام کی طرح ان کی رکاب تھامے پھرتے تھے، (سیرت سید احمد شہید ص ۲۱۵۰۳۵۰) اور اپنی جگہ پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کے سلسلے اور خاندان میں ان دو بزرگوں کا مرتبہ مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ سے کہیں بڑھا ہوا ہے، (سیرت سید احمد ص ۳۱۵) اس کی پیش بندی مولانا کس طرح فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

" .. .. .. مگر اس امارت کو تھامنے کے لئے جس قدر تعلق شاہ ولی اللہ کی تحریک اور پھر شاہ عبدالعزیز کے کام سے تاریخی طور پر ہونا چاہیئے، اس سے سید صاحب کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک نئی تحریک شروع کر دیں .. .. اس نقص کے جبر کے لئے مولانا عبدالحی اور مولانا شہیدؒ ان کے ساتھ لگا دیئے گئے "، (ص ۶)

---

[1] سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کے خطوط میں اس قسم کے بیانات اتنے واضح اور بے لاگ طریقے پر ہیں کہ ان میں کسی چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں ہے، ان خطوط کا ایک معتدبہ حصہ سوانح احمدی کے آخر میں موجود ہے (ص ۱۶۹۰۲۴۳) ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ مکاتیب کا اچھا خاصہ قیمتی ذخیرہ بھی محفوظ ہے۔ جن سے سیرت سید احمد شہید کے لائق مصنف نے فائدہ اٹھایا ہے (ص ۸) مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو مزید اقتباسات دیئے جاتے۔ ان بزرگوں کے بلند مقصد اور اسلامی روح کا اندازہ لگانے کے سلئے صرف ان دو خطوں کا مطالعہ کافی ہو گا جو سیرت سید احمد شہید کے (ص ۱۵۹۰۷) میں درج کئے گئے ہیں۔

اس بیان سے معاذ اللہ، یہ شبہ ہوتا ہے کہ شمنیں کے ذمہ جاسوسی کی خدمت سپرد کی گئی تھی، کہاں کی بات کہاں پہنچتی ہے۔؟

اس جبر نقص کی مزید تشریح مولانا کے شاگرد اور اس کتاب کے مرتب و شارح[1] مولوی نور الحق صاحب علوی کی زبان سے سُنیئے:۔

"امیر شہید دراصل اس حزب سے نہیں بلکہ بعد میں منضم کیے گئے، ان میں کشفی کمالات تھے سپاہ گری کی تعلیم بھی، پیند تھے، اس لئے ان کو امام عبدالعزیزؒ نے امارت جہاد کے لئے موزوں قرار دیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حزب مذکور کی راہ سے نہ ہٹ جائیں۔ ان کے ساتھ دو وزیر اپنے مکمل تربیت یافتہ لگا دیئے۔ مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشین حضرت شاہ اسحٰق کو مقرر کیا" (ص ۱۴۳)

آپ سمجھے یہ "نئی تحریک" کیا چیز ہے؟ اور "حزب مذکور کی راہ سے ہٹنا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کی تفسیر خود مولانا کی زبان سے سُننے کے لائق ہے۔

"اس طرح اس خاندان میں (یعنی حضرت سید شہید کے خاندان میں) حضرت مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہوگئیں۔ یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ سے متوارث چلی آتی ہے، بنابریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پورے طور پر رنگا جانا بعید ہے[2]۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے اپنے امیر المؤمنین ہونے کا اعلان کر دیا اور تحریک ناکام رہ گئی"۔

اچھا صاحب! سید صاحب نے موقع ملتے ہی "نئی تحریک" کھڑی کر دی اور اپنے امیر المؤمنین ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن امام عبدالعزیز کے مقرر کردہ اور "مکمل تربیت یافتہ" وزیروں (مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ) کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے بھی بیعت کر لی، اور صرف بیعت ہی نہیں کی، بلکہ اس کے انعقاد اور تبلیغ میں اپنے شایانِ شان نمایاں حصہ بھی لیا، (ملاحظہ ہو۔ مولانا شہیدؒ کا مکتوب مندرجہ سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۱۶۱-۱۶۹)

---

[1] یہ کتاب اصل میں مولانا سندھی نے املاء کرائی ہے اور علوی صاحب نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اسے مرتب کیا ہے اور ساتھ ساتھ تشریحی حاشیے بڑھا دیئے ہیں۔ (دیباچہ کتاب)

[2] خط کشیدہ فقروں کے علاوہ ان سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی صحت سے ہمیں انکار نہیں۔

علاوہ بریں مولانا کے بیان کے مطابق امام عبدالعزیزؒ نے "جمعیتہ مرکزیہ" کی مدد سے جو "نوجوان" تیار کیے" ان میں "سرکردہ" تین یا چار بزرگ تھے۔ (۱) مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ (۲) مولانا عبدالحیٔ دہلویؒ (۳) مولانا محمد اسحٰق (۴) مولانا محمد یعقوب (ص۱۱۲) اور یہ معلوم ہے کہ انعقاد بیعت کے اجتماع میں اس "سرکردہ جماعت" کے دو زیادہ ممتاز رکن شریک تھے۔ (یعنی مولانا عبدالحیٔؒ اور مولانا شہیدؒ) اور جب اس کی خبر مولانا اسحاق اور مولانا یعقوب کو ملی، تو وہ معترض نہیں ہوئے، بلکہ برابر "اموال و رجال" سے امداد میں سرگرم رہے۔ اس طرح پر "جمعیتہ مرکزیہ کی تربیت یافتہ" "سرکردہ جماعت" کا سید صاحبؒ کی امامت پر اجماع ثابت ہوتا ہے جس سے کوئی غیر جانبدار انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

رہی تحریک کی ناکامی" سو اس کے دوسرے اسباب ہیں، جن میں سرداران پشاور کی غداری اور سنگ دلی زیادہ اہم ہےؔ۔ خود مولانا بھی اس اجماع کو تسلیم کرتے ہیں، اور ساتھ ساتھ اسے "اختلافات کا منبع" بھی بتاتے جاتے ہیں:

"۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیزؒ کا انتقال ہوا۔ اسی سال سید صاحب اور ان کے رفقاء (مولانا اسمٰعیل و مولانا عبدالحیٔ وغیرہ) نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ ۱۲۴۲ھ میں سید صاحب کی امامت پر اجماع منعقد ہوا، اور وہی اختلاف کا منبع بن گیا" (ص۱۱۶)

دوسری جگہ اس "بیعت امامت" کو ان لوگوں کی "مداخلت" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو امام عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ نہ تھے۔

"یہاں یہ غلطی ہوئی کہ شاہ صاحبؒ کے فیصلے یعنی بورڈ کی حکمت کو نہ سمجھ کر سید صاحب کو امیر مطلق یعنی امام کے درجے پر مان لیا گیا اور یہ ان لوگوں کی مداخلت سے ہوا جو امام عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ نہ تھے۔ اس شکست میں اس اصولی تبدیلی کو بڑا دخل ہے" (ص۱۵۲)

خیر شکست کے اسباب تو دوسرے ہیں، یہاں ہمیں صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ "حزب ولی اللہ"

ؔ ناکامی کے اسباب کو ہم یہاں نہیں چھیڑنا چاہتے ورنہ مضمون تبصرہ کی حد سے نکل کر ایک رسالہ کی شکل اختیار کرلے گا۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے مقالے میں ناکامی کے اسباب پر مختصر لیکن اچھی تحقیقی بحث کی ہے، اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (الفرقان ولی اللہ نمبر طبع اوّل ص ۹۳-۹۸)

کے خاص ارکان اور امام عبدالعزیزؒ کے "تربیت کردہ اصحاب" اور سید صاحب کی جماعت میں "شیخین" کا رتبہ رکھنے والے بزرگوں (مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ) کی موجودگی میں دوسرے لوگوں کو "مداخلت" کا موقع کس طرح مل گیا؟ اور پھر صرف ان "وزیروں" پر بس نہیں، اُن "دلی الٹیبوں" نے بھی سید شہید کے ہاتھ پر بیعت کی، جو میدانِ جہاد سے دور ہندوستان میں تھے۔ خود مولانا کا بیان ہے:

واستخلفه الامام عبدالعزیز ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء لامامة الدعوة الی اتباع السنة والجهاد وجعل معه من العلماء مولانا عبدالحیؒ الصدر السعید و مولانا اسمٰعیل الصدر الشهید کالوزیرین و کان امرهم بالشوریٰ بینهم واذا اتفق الثلاثة علیٰ شئ یکون مثل حکم الامام عبدالعزیز (ص ۱۴۷)	"امام عبدالعزیزؒ نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں سید صاحب کو اتباعِ سُنّت اور دعوتِ جہاد کی سربراہی (امامت) کے لئے اپنا جانشین بنایا اور عُلماء میں سے صدر حمید مولانا عبدالحیؒ اور صدر شہیدؒ مولانا اسمٰعیلؒ کو وزیر کے طور پر ان کے ساتھ کر دیا۔ تمام اہم اُمور ان کے درمیان "شوریٰ" سے طے ہوتے تھے، اس طرح پر کہ اگر تینوں کسی بات پر متفق ہو جاتے تو وہ امام عبدالعزیزؒ کا فیصلہ سمجھا جاتا۔"

یہاں مولانا سندھی سے یہ خادم دریافت کر سکتا ہے کہ جب سید شہید کی بیعت امامت پر ان تینوں صاحبوں کا ("الثلاثة" بشمول سید صاحب) اتفاق ہو گیا تھا تو پھر اسے امام عبدالعزیزؒ کا فیصلہ کیوں نہیں سمجھا جاتا۔

ابھی سلسلہ بیان جاری ہے:۔

واقاموا حکومة موقتة کان امیرها السید احمد فی ۱۲ جمادی الاخرة سنة ۱۲۴۲ھ (۱۰ نومبر[1] سنة ۱۸۲۶ء)	"اور ان لوگوں نے ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ (۱۰ نومبر ۱۸۲۶ء) کو ایک حکومت موقتہ قائم کر لی جس کے امیر سید احمد تھے۔ اور اکثر

---

[1] ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے، دوسری جگہ اسی کتاب میں (ص ۱۵۶) تقریباً صحیح تاریخ دی گئی ہے (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء)، قمری مہینوں کی مطابقت میں ایک دن کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت انجمن ترقی اُردو (دلی) کی مرتّب کردہ جنتری (تقویم ہجری و عیسوی) ہے۔

وبایع الافاغنۃ اکثرھم بامامۃ الامیر ... وکذلک بایع امامۃ الامیر من کان من الولی اللّٰھیین بالھند وکانوا یمدونھم بالاموال والرجال	افاغنہ نے امیر کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی نیز امیر کی امامت کی بیعت ان ولی اللّٰہیوں نے بھی کی جو ہندوستان میں رہ گئے تھے اور وہ مجاہدین کی آدمی اور روپے سے مدد کرتے رہتے تھے ،،
(ص۱۴۳ بحوالہ کتاب التمہید)	(ص۱۴۵)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیّد شہید کی امامت پر وقت کے تمام ولی اللّٰہیوں کا اتفاق ہو گیا تھا، اور خود مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب بھی یقینی ان میں شریک ہوں گے۔ آخر وہ ولی اللّٰہیوں سے خارج تو تھے نہیں لیکن مولانا کو تو اپنا "نظریہ" پیش کرنا ہے۔ خواہ واقعات سے تائید نہ ہوتی ہو۔ اس لئے کتاب التمہید کے اس بے لاگ بیان کے ساتھ چند فقرے اپنے مطلب کے بھی چسپاں کئے گئے۔

وھذا الامر کان مرکز ادارتہ الدھلی (کذا) وکان الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق مدیرا، (ص۱۴۳)	"اس کا مرکزی دفتر دہلی تھا۔ اور مولانا محمد اسحاق اس کے ڈائرکٹر تھے،،

اصل میں "ھذا الامر" کا فقرہ ہے۔ اس سے اگر مراد امامت اور نصب امارت کی قوت سیاسی "قیادت علیا" مراد ہے تو وہ دہلی میں کیسے ہو سکتی ہے؟ امیر منتخب میدانِ جہاد میں موجود ہے، اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے خواص و عوام کے ساتھ امام عبدالعزیز کے مقرر کردہ وزیر بھی ہیں، انہی تینوں بزرگوں کا نام مولانا نے "بورڈ" رکھا ہے۔ اس کے بعد دہلی یا میدانِ جہاد سے دُور رہنے والے بزرگ صرف آدمی اور روپے (الاموال والرجال) سے مدد کر سکتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شاہ محمد اسحٰق اس میں سرگرم تھے اور ہو سکتا ہے کہ اس تنظیم کا بار ان ہی کے کندھے پر ہو۔[۱]

---

[۱] مولانا نے بار بار زور دیا ہے کہ "مولانا محمد اسحٰق کے ہاتھ میں روپیہ روانہ کرنے کا انتظام تھا" (ص۱۲۲) ، ہمیں اس کے ماننے میں ادنیٰ تامّل نہیں، اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شاہ محمد اسحٰق جماعت مجاہدین اور ان کے امیر کی اعانت میں سرگرم تھے۔ رہا یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا محمد اسحٰق ہی جزو کل تھے، اور سیّد شہیدؒ ان کے کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں،

اس حقیقت کو مولانا نے خود بھی ایک دوسری جگہ صاف طور پر بیان کیا ہے۔ عربی دنیا سے اسلامی ہند کی اس اسلامی تحریک کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

النهضة التي قام بها الامام
عبد العزيز الدهلوي ارتقت
من سنة ١٢٤٢ھ الى الحكومة
الموقتة الهندية في جبال
الافغانيين من حدود الهند
ورئيس تلك الحكومة الشرعية
كان امير المؤمنين السيد احمد
الدهلوي (؟)[1] (الامير الشهيد)
وصدارة وزرائها تسند الے
مولانا عبد الحي الدهلوي (؟)
(الصدر السعيد) والامور
الحربية والسياسية كانت
موكولة الى مولانا محمد اسمعيل
الدهلوي (الصدر الشهيد) واما
الامور التي تشبه الداخلية من
جمع الاموال وحشد الرجال و
غيرهما فكان وكيلها في الدهلي
(كذا) مولانا محمد اسحاق (الصدر الحميد)
(ص ۱۷۳-۱۷۵) بحوالہ مقدمہ المسوی مطبوعہ مکہ مکرمہ

"امام عبد العزیز کے ہاتھوں جو تحریک
اٹھی وہ آگے چل کر (۱۲۴۲ھ سے)
سرحدی علاقوں میں ایک حکومت
موقتہ ہندیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی
اس شرعی حکومت کے صدر
امیر المؤمنین سید احمد دہلوی (؟ بریلوی)
(امیر شہید) تھے۔ اور صدارت
عظمیٰ کا منصب مولانا عبد الحیؒ
دہلوی (؟ بڈھانوی) (صدر سعید)
کے سپرد تھا اور امور حربیہ وسیاسیہ
کی سربراہی مولانا محمد اسماعیل دہلوی
(صدر شہید) کے ذمہ تھی، باقی
رہے۔ وہ امور جو وزارت داخلیہ
کے منصب سے مشابہ ہیں، جیسے
آدمی اور روپے کی فراہمی وغیرہ
تو ان کے وکیل دہلی میں مولانا
محمد اسحاق (صدر حمید)
تھے"؛

[1] پتہ نہیں۔ سید شہیدؒ کو دہلوی کس طرح لکھ دیا گیا؟ ممکن ہے کتابت یا طباعت کی غلطی ہو۔ مولانا عبد الحیؒ بڈھانوی کو شاید قرابت کے باعث دہلوی لکھا گیا ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا کا یہ بیان اس باب میں فیصلہ کن ہے، رئیس حکومت اور وکیلِ داخلیہ کے مراتب میں جو فرق ہے وہی سید شہیدؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے درمیان ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اور یہ ان بزرگوں کے باہمی "فرق مراتب" کے متعلق عرض کیا جا رہا ہے ورنہ ہمارے لئے سب لائق احترام و عقیدت ہیں ؎

ایں سلسلۂ طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

اور حاشا کہ ہمارے وہم وگمان میں بھی کسی کے ساتھ سوءِ ادب کا ادنیٰ شائبہ آیا ہو۔ اعاذنا اللہ من ذلک وکفیٰ بہ علیما۔

سید شہیدؒ اور مولانا محمدؒ اسحاق کے درمیان کیا فرقِ مراتب تھا۔ اور یہ کہ شاہ اسحاق صاحب سید صاحبؒ کی مالی امداد میں کس قدر سرگرم تھے، اس کا اندازہ خود حضرت سید شہیدؒ کے ایک مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو میدانِ جہاد سے مولانا محمد اسحاق کے نام تحریر کیا گیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، از امیر المومنین سید احمد بخدمت بابرکت صاحبزادۂ والاتبار مولانا محمد اسحاق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد از سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح آنکہ بتاریخ دہم ماہ رمضان ہنڈوی مبلغ ہفت ہزار و صد و پنجاہ روپیہ رسیدہ، لیکن بجز پرچہ کاغذ یک خرمہرہ ہم نہ رسید، موجبش دریافت نیست، لازم کہ سبب تعویق آں برآں بزنگارند، زیادہ والسلام مع الاکرام (سوانح احمدی ص ۲۳۵)

کیا سید صاحبؒ کے مرتبے کا آدمی جو اعلیٰ "کشفی قوت" کا حامل ہو، اپنے مطاع اور سردار کو صاحبزادہ والاتبار سے خطاب کر سکتا ہے؟

"کمپنی بہادر" سے سازباز کا الزام

اب ہم انتہائی رنج و قلق کے ساتھ مولانا سندھی کی کتاب سے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ سید صاحبؒ اور ان کے خاص ماننے والوں پر "کمپنی بہادر" سے سازباز کا الزام لگایا ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ہاں! تو مولانا فرماتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔۔ لہٰذا سید صاحب اور ان کے مجاہدین کو دلّی کے مرکز کے تابع ہو کر کام کرنا چاہیے تھا۔ ان کو روپیہ اور آدمی دہلی سے بھیجے جاتے ہیں، یعنی سارا مقصد دلّی کی آزادی کو مستحکم بنانا تھا مگر اب سید صاحب خلیفہ کہلانے لگے اور ساری دنیا کے ایک بڑے امیر بن گئے۔ یعنی اگر افغان سرداروں کے لئے ان کی اطاعت مذہبی فرض ہے، تو بخارا، ترکی، دوسرے ممالک بھی ان کی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ۔۔۔۔۔۔۔ امیر شہید کو اس طرح امام مہدی کے درجہ کے قریب لانے کی کوشش کی گئی، اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی۔ ہمارے خیال میں اس تمام تر تغیر میں کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چال کو بڑا دخل ہے۔" (ص ۹-۱۵۸، حاشیہ)

اس مختصر سی عبارت میں ایسی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا مولانا کے دماغ کے سوا کہیں وجود نہیں۔

(الف) سید صاحب کا مقصد دہلی کی حکومت کو مستحکم بنانا کبھی نہیں رہا۔ سید شہیدؒ اور مولانا شہیدؒ کے مکاتیب اور بیانات اس باب میں روز روشن کی طرح نمایاں ہیں۔ کہاں دلّی کی حکومت اور کہاں تمام اقطارِ عالم میں احکامِ ربّ العالمین کے اجراء کا عزم بلند ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار   فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

دلّی کی حکومت کا ذکر ابھی اوپر بھی آچکا ہے۔

(ب) سید صاحب یا ان کے ماننے والوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ تمام دنیائے اسلام کے امام مطلق تھے۔ البتہ سرحد کے قیام اور دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں سے حلقۂ نفوذ میں وسعت ضرور ہو رہی تھی۔

(ج) "امام مہدی" کے قریب لانے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ یہ مولانا کا انتہائی مبالغہ ہے۔

(د) "اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی۔"

گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۸۲۲ء اور ۱۸۲۶ء کے دوران میں مرکزی حکومت کی کچھ اہمیت باقی رہ گئی تھی؟ اہل علم بتائیں کہ یہ بیان کہاں تک حقیقت سے تعلق رکھتا ہے؟ تاریخ تو ہمیں بتاتی ہے، کہ

دلی کی مرکزیت شاہ عالم (۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء - ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء) ہی کے زمانے میں ختم ہوچکی تھی۔ اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء - ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۷ء) کے دور میں تو دلی کی حکومت بالکل برائے نام رہ گئی تھی، اور لال قلعہ کی وقعت ایک امیر کی حویلی سے زیادہ نہیں تھی (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ہاشمی جلد سوم ص ۲۸۶ - ۲۷۱)

(۵) یہ سب باتیں تو غلط تھیں ہی، لیکن مولانا کا درپردہ یہ فرمانا کہ "مجاہدین کو کمپنی بہادر نے استعمال کیا" یا یہ کہ سید صاحب کی امامت اور بیعت میں کمپنی بہادر کو دخل تھا۔ سراسر بہتان ہے۔ آخر "اس تمام تر تغیر" سے مولانا کی مراد ہو کیا سکتی ہے؟ سید صاحب کا دلی کے مرکز کے تابع نہ ہونا یا ان کا امیر المومنین منتخب ہونا، اس کے علاوہ تو اور کوئی بات اوپر نہیں کہی گئی ہے۔ اللہ جانتا ہے (اور مولانا اس حقیر سے زیادہ بہتر جانتے ہیں) کہ اس بیعت اور اجتماع کلمہ میں کمپنی بہادر کو ادنیٰ دخل بھی نہیں تھا، سچی بات یہ ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے سرفروش مجاہدوں پر اس سے زیادہ اور کوئی ظلم نہیں ہوسکتا۔

"کمپنی بہادر" کے طرزِ عمل کی اصل حقیقت

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ مولانا نے آخر ایسی بات کہی کیونکر؟ تو اس کے متعلق بھی صاف صاف عرض کردوں۔ بہت سی باتیں ہر موقع پر نہیں کہی جاتیں۔ مگر اب وقت آگیا ہے۔ تو سن لیجئے۔ کمپنی بہادر کی چال صرف اتنی تھی کہ ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء اور ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء تک اور پھر سید صاحب کی شہادت ۱۲۴۶ھ کے بعد بھی الحاقِ پنجاب ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء تک اس نے آدمی اور روپے کی فراہمی میں کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ ہنٹر[1] لکھتا ہے کہ بعض کارخانوں کے مسلمان ملازمین چھٹی لے کر جہاد کو جایا کرتے تھے[1]۔ مولانا محمد اسحاق کو ایک مہاجن سے جہادیوں کی امدادی رقم جو اس نے غبن کرلی تھی۔ عدالت سے دلوائی گئی[2] مقصود یہ تھا کہ مجاہدوں اور سکھوں کی معرکہ آرائی میں کچھ سرکار عالی کا فائدہ ہی ہو رہے گا[3]

---

[1] "OUR INDIAN MUSALMANS."

[2] SIR SYED AHMAD ON DR. HUNTER'S "OUR INDIAN MUSALMANS."

(مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء ص ۲۲-۲۱)

[3] اب اگر سکھوں اور مجاہدین ہند کی باہمی معرکہ آرائی سے واقعی کمپنی بہادر کو کچھ فائدہ پہنچا تو اس کا الزام سکھوں اور ان کی ظالمانہ روش پر عائد ہوتا ہے۔

لیکن جونہی پنجاب کا الحاق ہوا (۱۸۴۹ء) کمپنی اور سرکار کی نگاہ میں مجاہدین سے برا کوئی نہیں تھا۔ اور پھر کوئی کسر نہیں تھی، جو انہیں کچلنے کے لئے اُٹھا رکھی گئی ہو۔ اور یہی سخت جان لوگ تھے۔ جو ان حالات میں چالیس سال تک حکومت کا مقابلہ کرتے رہے۔[1]

یہ ہے مولانا کے الزام کی حقیقت جو صاف صاف بیان کر دی گئی، لیکن مولانا اسی الزام کو دوسری جگہ اس طرح دُہراتے ہیں کہ اس کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، وہ سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے جان نثاروں کو کمپنی بہادر کا آلہ کار بتاتے ہیں، اگر کوئی دُوسرا اس قسم کی بے بنیاد بات کہتا تو اس کی ناواقفیت اور تعصب پر محمول کر کے صبر کر لیتے، لیکن اگر سید شہیدؒ کے اصحاب خاص پر مولانا سندھی کمپنی سے سازباز کا الزام لگائیں تو بتایئے کہ صبر کے لئے پتھر کا کلیجہ کہاں سے لایا جائے۔ قال اللہ تعالیٰ:

"..... فکان (کانت) الحرب بینھم وبَین المتغلبین علی مسلمی الفنجاب (فنجاب) سجال (؟ سجالاً) حتی اندھش مِنھُم اداء الجمعیۃ النجادیہ الانکلیزیہ فاستعانوا بالمسلمین المخالفین للولی اللّٰھیین وامدّوھم بالاموال فوصلوا الی بلاد الافاغنۃ فاوقعوا الشقاق بین الھندیین المھاجرین وبین الافاغنۃ الوطنیین۔ (ص ۴۸ بحوالہ کتاب التمہید)

"تو مجاہدین اور مسلمانان پنجاب کے (خود ساختہ) ظالموں حاکموں کے درمیان لڑائی برابر کی رہی، تا آنکہ کمپنی بہادر کے اہلکاروں کے دل میں کھٹکا پیدا ہوئی، اس لئے انہوں نے ان مسلمانوں سے کام لیا۔ جو ولی اللّٰہیوں کے مخالف تھے۔ اور ان کی روپیوں سے امداد کی تو یہ لوگ افغانوں کے ملک میں آئے۔ اور انہوں نے ہندی مہاجروں اور ملکی افغانوں کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی۔"

---

[1] ملاحظہ ہو (۱) سیرت سید احمد شہید باب چہارم (۲) تواریخ عجیب (مولوی محمد جعفر تھانیسری) (۳) تذکرہ صادقہ (مولانا عبدالرحیم صادق پوری (۴) ہنٹر کی کتاب "OUR INDIAN MUSALMANS" (۵) ٹیلر (TAYLOR) کی "THIRTY EIGHT YEARS IN INDIA" وغیرہ وغیرہ

علمائے صادق پور کا "اصل" گناہ عمل بالحدیث

آپ سمجھے یہ سرکار کمپنی کے آلۂ کار کون تھے، بڑے بڑے عالم متبع سنت، جہاد کے شیدائی شوکانی اور مولانا شہید کے شاگرد اور پھر ان پر یہ الزام کیوں تراشا گیا۔ اس لیئے کہ وہ حنفی نہیں تھے۔ ائمہ حدیث کے مسلک کے مطابق رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے۔ اور مولانا کے خیال میں ولی اللّٰہیوں کے مخالف بھی تھے، ہمارے وہم میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ حنفیت کی عصبیت ایک وسیع النظر عالم کو ایسی غلط بیانیوں پر آمادہ کر سکتی ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ سید صاحب معصوم تھے یا ان کے سرفروش اہل حدیث جان نثاروں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ان میں سے گرم لوگوں نے افغانی علاقے میں عمل بالحدیث پر اصرار کر کے اگر یہ واقعہ ہے، مصلحت شناسی کا ثبوت دیا۔ لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ سید صاحب اور ان کی جماعت کے مخصوص اور با اثر اصحاب کا دامن کسی اجنبی حکومت کے ساتھ ساز باز سے یکسر پاک رہا ہے۔

ہندوستان کے عاملین بالحدیث سے مولانا بہت رنجیدہ ہیں۔ اس پر اطمینان سے گفتگو ہو گی۔ ابھی تو سید صاحب ہی پر اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے۔

سید صاحب "ڈکٹیٹر" تھے؟

ہندوستانی انقلاب کی جو خصوصیت اس تحریک کے ذاتیات میں داخل تھی وہ تعقید آمیز ہوتی گئی، یعنی ماورائے سندھ کا مرکز مستقل بن کر دہلی سے سرکشی اور بغاوت کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حزب ولی اللّٰہ کی حکومت کا طریقہ ا۔ رڈ کی حکومت سے شخصی امامت (ڈکٹیٹر شپ) میں تبدیل ہو گیا۔ اس طرح امیر شہید امیر المؤمنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے گئے (ص ۹-۱۵۸)

ان طنزیات کا نمونہ اوپر گذر چکا ہے، البتہ سرکشی اور بغاوت کے میٹھے بول قابل توجہ ہیں، رہی ڈکٹیٹر شپ اور شخصی امارت تو یہ سید صاحب اور ان کے وزیر شہید کی اپنی ایجاد نہیں اگر یہ ... نا قابل قبول اور گردن زدنی چیز ہے تو پھر سید صاحب کے کونسا قصور کیا ہے خلافت راشدہ اور شیخین رضی اللّٰہ عنہما ہی کو ہدف ملامت بنانا چاہیئے، باقی امیر المؤمنین" اور "مصلح خلیفہ" کے طعنے تو افسوس کہ یہ شیخ الہند کے شاگرد اور "حکمت ولی اللّٰہی" کے شارح و مفسر کی زبان سے اچھے نہیں معلوم

ہوتے۔ ہم نیازمندوں کی کیا مجال کہ جواب میں کچھ عرض کر سکیں۔

قومی ھُمُ قتلوا اُمیم اخی فاذا رمیتُ یُصیبنی سَھمی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ڈکٹیٹر شپ (؟ امامت) کی مولانا نے ایک اور توجیہ پیش کی ہے :۔

"اس کے بعد (ہنڈ کی بیعت کے بعد) ایک سال تک مولانا عبدالحئی (ف ۱۲۴۳ھ) زندہ رہے۔ ان کی موجودگی میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا۔ سید احمد شہید ان کے سامنے اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے بلکہ اجتماعی فیصلہ حکومت کر رہا تھا۔" (ص ۷-۱۵۶)

اگر سید صاحبؒ کسی مسئلے میں بھی اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے تو ان کی بیعت پر اجماع ایک لغو فضل تھا اور مولانا عبدالحئیؒ نے بیعت کرنے میں سخت غلطی کی تھی۔ اسلام میں شوریٰ کی تاکید ضرور ہے لیکن امام ہر حال میں مجلس شوریٰ کی رائے کا پابند نہیں، کیا مولانا عبدالحئیؒ بڈھانوی سا عالم متبحر اتنی سادہ حقیقت بھی نہیں جانتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی اس قسم کی توجیہوں کی زد صرف سید صاحب ہی پر نہیں، بلکہ اُن کے حزب ولی اللٰہی کے خاص ارکان پر بھی پڑتی ہے۔

اور مولانا عبدالحئیؒ کے اس اثر و نفوذ کی تائید میں حسب ذیل قصہ دہرایا گیا ہے :۔

"سید احمد شہیدؒ ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں آکر شریک ہوئے نماز سے فارغ ہو کر مولانا عبدالحئی نے "مابال اقوام" کے طور پر فرمایا کہ ایسے لوگ جو سُنّت کے احیاء کے مدعی ہیں وہ جماعت میں بھی صحیح طور پر حاضر نہیں ہو سکتے۔ سید صاحب نے فرمایا۔ مولانا آپ کا یہ ارشاد حق ہے اور ہم سے پھر ایسی کوتاہی نہیں ہوگی، اور یہ آپ کا فرض ہے، کہ آپ اس طرح ٹوکیں، مولانا عبدالحئی نے کہا کہ یہ عذر صحیح نہیں ہے، آپ کو صحیح طور پر کام کرنا چاہیئے، ہر روز کون ٹوک سکتا ہے؟ امام بنتے ہو تو آگے بڑھ کر کام کرو۔[2]"

---

[1] خود شاہ عبدالعزیزؒ انہیں شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے تھے (سیرت سید احمد شہید ص ۲۰۵)

[2] اصل میں فقرے خط کشیدہ نہیں۔

پہلے اس قصے کے آخری فقروں کا تیور ملاحظہ ہو، اس کے بعد مصنف سیرت سید احمد شہیدؒ کا یہ بیان جو اپنی جگہ پر کافی وشافی ہے۔

"سید صاحب کی جماعت میں آپ کی وہ حیثیت تھی جو بلاتشبیہ صحابۂ کرام میں حضرت صدیق اکبرؓ کی، آپ پر شانِ صدیقیت اور شاہ صاحبؒ پر شانِ فاروقی غالب تھی، .... امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نہایت چست و مستعد رہتے، اور اس میں اپنے شیخ کا بھی جس سے زیادہ محترم ہستی، آپ کی نظر میں کوئی نہ تھی، لحاظ نہ کرتے۔ ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحبؒ کو خلافِ معمول جماعت میں کچھ تاخیر ہوگئی، دوسرے دن پھر اتنی تاخیر ہوئی کہ تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، مولانا نے سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ عبادتِ الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت، سید صاحب خاموش ہوگئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں سید صاحبؒ کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، اس دن مولانا عبد الحیؒ نے اسی کا وعظ فرمایا۔ ایک مرتبہ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر مجھ سے کوئی بات خلافِ سُنّت دیکھیے، متنبہ کر دیجئے گا۔ مولانا نے فرمایا کہ حضرت! جب کوئی مخالفِ سُنّت فعل آپ سے عبد الحیؒ دیکھے گا تو وہ آپ کے ساتھ ہوگا ہی کہاں........" (ص ۳۱۶ طبع دوم)

اُوپر مولانا ابو الحسن علی حسنی نے بھی مولانا عبد الحیؒ کے احتساب کے تین واقعے بیان کئے لیکن کہیں وہ تلخی نہیں، جو مولانا سندھی کی روایت میں ملتی ہے اور پھر لہجے کی تلخی، مندرجہ ذیل واقعہ پڑھ کر اور بھی بعید معلوم ہوتی ہے۔ مولانا سندھی کی روایت ہے[۵]:۔

"جب مولانا عبد الحیؒ کا آخری وقت تھا، تو سید صاحب نے اُن سے فرمایا کہ مولانا آپ کی اگر کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کردوں۔ آپ نے کہا آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھیں، یہی ایک خواہش باقی ہے، سید صاحب نے اس کی تعمیل کردی۔ الغرض ادب بھی انتہائی درجہ کا ملحوظ ہے۔ اور ان کو قاعدے کے اندر پابند رکھنے کی قوت بھی ہے۔" (حاشیہ ص ۵)

---

[۵] یہ ہر دو واقعے ہمیں مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے سنائے۔ غالباً انہوں نے مولانا محمد قاسم یا مولینا رشید احمدؒ سے سُنے ہوں گے (ص ۱۵۸ حاشیہ)

اب یہی واقعہ سید صاحبؒ کے مستند سیرت نگار کی زبانی ملاحظہ ہو۔

"انتقال کے وقت سید صاحبؒ سے فرمایا کہ حضرت شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی، اب اتنی تمنا ہے کہ آپ اپنا قدمِ مبارک میرے سینہ پر رکھ دیجئے کہ اسی حالت میں میری جان نکل جائے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ اس سینہ پر رکھوں جو قرآن و حدیث کے علم کا خزینہ ہے۔ آپ نے تسلی کے لئے اپنا ہاتھ آپ کے سینہ پر رکھ دیا۔ اور اسی حالت میں آپ کا انتقال ہوگیا" (سیرت سید احمد شہید ص ۳۲۲)

دیکھیئے دونوں روایتوں کی زبان میں کتنا فرق ہے۔ بہر حال ہمیں ان روایتوں کی صحت سے انکار نہیں۔ (البتہ مولانا سندھی کی روایت میں بعض فقرے بعید معلوم ہوتے ہیں) لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا عبدالحیؒ کی وفات کے بعد سید صاحب بے قابو ہوگئے، بالکل غلط ہے۔ آخر مولانا شہیدؒ تو آخری لمحاتِ حیات تک ساتھ ہی رہے (جن پر بقول ابوالحسن علی شانِ فاروقیت غالب تھی)۔

"شمسی قومی نوروز" منانے کی تلقین

مولانا ایک طرف تو سید صاحبؒ کی امارت و امامت سے برہم ہیں، (جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا) دوسری طرف انعقاد بیعت کی تاریخ کو "وہ شمسی قومی نوروز" بھی منانا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"۱۲۴۱ھ میں ہجرت شروع ہوئی، اور ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی قبائل نے بھی ہنڈ میں سید احمد کو اپنا امیر مان لیا" (ص ۱۵۶)

ہنڈ پر حاشیے میں لکھتے ہیں:۔

"ہنڈ کا تعلق ہماری سیاسی تاریخ سے نہایت قوی ہے۔ یہ ہنڈ وہی مقام ہے، جہاں ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ کو "فرقہ ولی اللّٰہیۃ" کے مقدمۃ الجیوش نے جسے امام عبدالعزیز دہلوی نے تیار کیا تھا، اپنی حکومت موقتہ قائم کی، اس کے رئیس امیر شہید دہلوی (یا بریلوی) تھے۔ جمہور مسلمین نے بیعت کی اور انہیں امیر مان لیا گیا۔ اتفاق سے یہ تاریخ ۱۰ جنوری[ل] ۱۸۲۷ء کے

ل ہم ابھی اوپر لکھ آئے ہیں کہ ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے (تقویم ہجری و عیسوی) سیرت نگاروں نے دن کی تعیین نہیں کی اس لئے یقین کے ساتھ ان دونوں تاریخوں میں کسی ایک کو ترجیح نہیں دی جا سکتی قمری مہینوں کی مطابقت میں یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے

موافق تھی، اس لئے ہمارا شمسی قومی نوروز اس واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ۱۰ جنوری کو منایا جائے گا۔ جس قدر ہندوستانی مسلمانوں میں قومی رُوح پیدا ہوگی، اسی انداز سے وہ ہماری تجویز کی تائید کریں گے۔" (ص ۱)

اس ارشادِ گرامی کا خلاصہ ان دفعات میں کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) سید صاحبؒ کی امارت مان لی گئی۔

(۲) انعقادِ بیعت کی تاریخ نہایت مہتم بالشان اور وہ دن ایک تاریخی دن ہے۔

(۳) شمسی قومی نوروز منایا جائے۔

(۴) ہندوستانی مسلمان میں قومی رُوح پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

کاش! مولانا ہمیں بتاتے کہ امام ولی اللہ نے کس کتاب میں شمسی قومی نوروز منانے کی تلقین کی ہے یا اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے؟ دوسری بات یہ عرض کرنا تھی کہ سید صاحب کی "امارتِ مطلقہ" (یعنی اندرونِ ہند کی نگرانی سے آزاد) تو غلط تھی، پھر ان کے انعقادِ بیعت کا دن اتنا اہم کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ باقی "نیشنلزم" کے متعلق تو مولانا کا خیال واضح ہو چکا ہے اس لیے کچھ مزید عرض کرنا بے سود ہے۔ رہا ایک مسلمان کا نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہیئے؟ تو اُسے عارف سیالکوٹی کی زبان سے یوں ادا کر سکتے ہیں:۔ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (اقبال)

اس سلسلے کی ایک اور بات رہ گئی۔ امام عبد العزیز (ف ۱۲۳۹ھ) کے بعد مسندِ درس کی جانشینی مولانا محمد اسحاق کو تفویض ہوئی۔ اس سے مولانا نے شاہ محمد اسحاق صاحب کی امارتِ مطلقہ پر استدلال کیا ہے[۱]

---

[۱] مولانا فرماتے ہیں: "امام عبد العزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعتِ طریقت لینے کے لیے اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ میں بیعتِ جہاد لینے کے لئے دَورے پر بھیجا۔ اس کے بعد سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم دیا، تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہو جائے۔ جب قافلہ حج سے ۱۲۳۹ھ میں واپس آیا تو امام عبد العزیز فوت ہو چکے تھے۔ انہوں نے آخری وقت میں مولانا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کر کے اپنا قائم مقام بنا دیا تھا۔" (ص ۱۵۳)

حالانکہ اس سے مدعا ثابت نہیں ہوتا، جب سید صاحب کی امامت پر ہندوستان اور ماوراء سرحد کے تمام مجاہدوں اور ولی اللٰہیوں نے بیعت کر لی اور شاہ اسحاق صاحب نے اس پر اعتراض نہیں کیا، بلکہ برابر آدمی اور روپے سے مدد کرتے رہے، تو ان کی حیثیت اندرونی ناظم اور وکیل سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ خود مولانا کتاب "التمہید" میں اعتراف کر چکے ہیں، "رہا مدرسہ کا سپرد کیا جانا" تو اس کی حیثیت ایک مقامی ضرورت کی انجام دہی سے زیادہ نہیں ہے (اور بقول حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدرسوں اور حجروں کا کام تو ہر کوئی کر لیتا ہے لیکن میدان والا کام کم لوگوں سے بن آتا ہے۔ او کما قال فی کتابہ "تذکرہ")، اس سے شاہ محمد اسحاق صاحب کا علمی مرتبہ ضرور معلوم ہوتا ہے جس میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ اور اگر صرف مسندِ درس کی جانشینی امارت و امامت پر دلالت کرتی ہے، تو مولانا کیا فرمائیں گے۔؟

سیّد نذیر حسینؒ کی جانشینی

میاں صاحب مولانا سیّد نذیر حسین محدّث (سُورج گڈھی مونگیری) دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کی امامت کے بارے میں؟ شاہ محمد اسحاق صاحب کی ہجرت (شوال ۱۲۵۸ھ) کے بعد میاں صاحب ہی جانشین ہوئے۔ اور انہوں نے مسلسل ایک عرصہ دراز تک مسندِ ولی اللٰہی[1] پر درس دینے کی عزت حاصل کی، پھر آپ شاہ اسحاق صاحب کے بعد امارت اور اپنے حزب ولی اللٰہی کی قیادت

---

[1] مولانا شاہ صاحب کے مدرسہ کو ولی اللہ کالج کہنا پسند کرتے ہیں (حاشیہ ص۴۳، ص۴۷) پتہ نہیں کالج کے لفظ میں کیا جادو ہے؟ کہ ہمارے اکابر بھی اس سے مسحور ہیں۔ آگے بڑھ کر (ص ۴۴ حاشیہ) شاہ محمد اسحاق صاحب (ف ۱۲۶۲ھ) کی ہجرت (۱۲۵۸ھ حیات بعد المماتص ۵۳) کے بعد میاں صاحب کی جانشینی کا تذکرہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، جانے کیوں مولانا اہل حدیث ... وں سے اتنے بیزار ہیں؟

ھ - ی حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کی جانشینی کو مولانا سندھی کے علاوہ دیگر علمائے احناف نے بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ تاریخی طور پر یہ ایک مسلّمہ بات ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:-

حاجی امداد اللہ صاحب (ف ۱۳۱۷ھ) کو کیوں سونپنے ہیں؟ گویا آپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ مسندِ درس کی جانشینی حزب کی امامت وامارت کے لیے کافی نہیں۔

تذکرہ نگاروں پر برہمی

سید شہیدؒ کے ساتھ مولانا ان کے تذکرہ نگاروں اَور ثنا خوانوں سے بھی برہم ہیں، جس کا کوئی شکوہ نہیں،

حاشیہ صفحہ گذشتہ) "مدرسے کے دوسرے معلم مولوی عبدالخالق کے داماد شمس العلماء علامہ سید نذیر حسین تھے جن کے علم وفضل کا یہ مرتبہ تھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب مہاجر مکی نے ہجرت کے وقت افادہ وافتاء اور تدریس کی خدمت ان کے سپرد کر کے خلیفہ وجانشین مقرر فرمایا تھا۔" (مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال وآثار، صفحہ ۶، مجلس ترقی ادب لاہور۔ نومبر ۱۹۷۱)

اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:-

" مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی اہل حدیث واحناف میں مابہ النزاع بن گیا ہے۔ احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا۔ اور اہلحدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں۔ مجھے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بہ تصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درسِ حدیث میں وہ داخل ہوئے۔ عبارت یہ ہے۔

" و در ہمیں سال (سنۃ الف و مائتین و تسع واربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحٰق مرحوم ومغفور شروع نمودند وصحیح بخاری وصحیح مسلم بہ شراکت مولوی محمد گل کابلی ومولوی عبداللہ سندھی ومولوی نور اللہ سروانی و حافظ محمد فاضل سورتی وغیرہم حرفاً حرفاً خواندند وہدایہ وجامع صغیر بمعیت مولوی بہاؤ الدین دکنی وجدۂ امجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی ونواب قطب الدین خاں دہلوی وقاری اکرام اللہ وغیرہم وکنز العمال ملا علی متقی علیحدہ شروع فرمودند ودو سہ جزء خواندند وسنن ابی داؤد وجامع ترمذی ونسائی وابن ماجہ وموطا امام مالک بتمامہا بر مولانا ممدوح عرض نمودند واجازت از شیخ الآفاق حاصل نمودہ"

البتہ شاہ صاحب سے سند واجازت تحریری انہوں نے دو شوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی ہے جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے جارہے تھے" (حیاتِ شبلی" ص ۴۵-۴۶ (حاشیہ) دار المصنفین اعظم گڑھ)

البتہ رنج اس بات کا ہے کہ کہیں کہیں ان مخلصوں پر بے جا حملے کئے گئے ہیں، ص ۷۰ میں مولانا نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشہور خواب کا ذکر کیا ہے اور شارح نے کتاب التمہید کی عبارت کے ساتھ سیرت سید احمد شہید (ص ۴۴ ، طبع دوم) سے بھی مندرجہ ذیل سطریں نقل کی ہیں۔

"صبح اٹھ کر شاہ صاحب، سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی مظہری خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور خواب کی تعبیر چاہی شاہ غلام علی نے فرمایا ...... کہ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے (یا آپ کے کسی مرید رشید[1]) کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وفیض کا سلسلہ جاری ہوگا۔ (ص ۷۸)

اس کے بعد شارح مولوی نورالحق صاحب علوی فرماتے ہیں۔

"مولانا الشیخ عم فیضہم نے مجھ سے ۲۶ ؍ جون ۱۹۴۰ء کو فرمایا کہ یہ خواب امام عبدالعزیز کی عظمت پر دال ہے کہ اُن کے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی بغیر آپ کے ممکن نہ تھی۔ رہا فقرہ محصورہ بین الخطین، ہمارا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علیؒ کے ذمہ لگا کر محض اس لیے بڑھایا گیا کہ سید امیر شہید کی فضیلت ثابت کی جا سکے، ورنہ اصل خواب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔"

آپ نے دیکھا پہلے "یا آپ کے کسی مُرید رشید" والے فقرے کو بین الخطین کیا گیا، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ فقرہ محصورہ بین الخطین بعد کا اضافہ ہے۔ سبحان اللہ!! اعتراض کی کیا دلچسپ صورت نکالی گئی ہے۔

"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" شاید اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ فقرہ مذکورہ بعد کا اضافہ نہیں ہے۔ سیرت سید احمد شہید کے مصنف نے یہ واقعہ غالباً مخزن احمدی سے لیا ہے۔ جو سیّد صاحبؒ کے بڑے بھانجے (اور ان سے عمر میں بڑے) اُن کے خلیفہ اور رفیقِ سفر مولوی سید محمد علی صاحب (ف ۱۲۶۶ھ) کی تصنیف ہے (سالِ تصنیف ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) بہرحال انہوں نے جہاں سے بھی لیا ہو، یہ واقعہ

---

[1] سیرت سید احمد شہید میں یہ فقرہ بین الخطین نہیں ہے (طبع دوم ص ۴۴، طبع اول ص ۷۸)

مخزنِ احمدی میں بلعینہٖ مذکور ہے، جو سید صاحب کے ابتدائی حالات میں سب سے بڑا ماخذ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"....... صبح گاہان امام المحدثین بملاقات حضرت سید غلام علی صاحب کہ از خلفائے حضرت شمس الدین شہید کہ مشہور بہ مرزا مظہر مرحوم اند رفتہ ایں رویا بیان نمودہ تعبیرش خواستند..... سید علیہ الرحمتہ سر بگریبان آوردہ فرحاں و خنداں فرمودند کہ صاحب در ذہن ناقص چناں معلوم می شود کہ از آں حضرت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بخلائق از وفات حضرت سید حسن رسول نما کہ مدت یک صد و پنجاہ سال گذشتہ موقوف و مسدود است اینک ایں حالت غریبہ از دست شما یا یکے از مریدانِ شما ظاہر و منتشر خواہد شد....."

(مخزن احمدی (قلمی) ورق ۲۸، الف و ب مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ نمبر ۱۳۸۵)

ہم نہیں سمجھتے کہ مولوی سید محمد علی صاحب نے یہ فقرہ (یا یکے از مریدان شما) اپنی طرف سے تصنیف کیا ہوگا، کم سے کم سید صاحب کے خلفاء اور رفیقوں کے بارے میں ہم ایسی بدگمانی نہیں کرتے۔

تذکرہ نگاروں کا ذکرِ خیر ایک دوسرے موقع پر اس طرح کیا گیا ہے۔

"ہمارے زمانے کے مورخین نے اس تحریک کے بیان میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ وہ سید صاحب کا تعلق امام عبدالعزیز سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ اور امیر شہید کو ایک مہدی منتظر کے درجے پر دیکھنا چاہتے ہیں، (ص ۱۱۵)

ہمارے زمانہ کے سیرت نگار مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مقبول کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" پڑھ کر ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ انہوں نے امام عبدالعزیز سے سید صاحب کے تعلق کو کاٹنے کی کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہے؟ (ملاحظہ ہو، سیرت سید احمد شہید ص ۵۸۔۵۲) اور ہمارے زمانے سے پہلے کے تذکرہ نگار مولوی سید محمد علی صاحب اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (اسیر لورٹ بلیر و مُتّہم مقدمۂ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء) کی کتابیں موجود ہیں۔ ہر منصف مزاج پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ مولانا کا یہ الزام کہاں تک صحیح ہے؟ "مہدیٔ منتظر" کا افسانہ سراسر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔

سید صاحبؒ کے متعلق یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی انہیں دینی علوم سے ضروری واقفیت تھی، اس سے کسی نے انکار نہیں کیا (سیرت سید احمد شہید ص ۵۸)

لیکن بدگمانی کا بُرا ہو، مولانا اس سے بھی غلط نتیجہ نکالتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح پر ہم سید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں۔ ان کے مناقب لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے، بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں، ان کی خواہش دراصل یہ ہے کہ سید صاحب کا جو تعلق تلمذ شاہ عبدالعزیز سے ہے وہ کاٹ دیا جائے، اور وہ ایک امام مہدی کے طور پر مانے جائیں، ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا" (ص ۱۴۴)

مولانا فرماتے ہیں کہ "ان کے مناقب لکھنے والے دھوکا دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے" اچھا تو سُنیئے سید شہید کے وزیر و مشیر اور تتمۂ دُودمانِ ولی اللّٰہی، حضرت مولانا اسماعیل شہید (نضّر اللہ وَجھَہٗ یَومَ القِیَامَۃِ) فرماتے ہیں:-

"اگرچہ احسن واولیٰ در تالیف ایں کتاب چناں می نمود کہ بطوریکہ در تحریر اکثر مضامین ایں کتاب محض بر ترجمہ آنچہ از زبان ہدایت نشان حضرت ایشاں صدور یافتہ بود اکتفا کردہ شد در تمامی مضامین ہماں راہ پیمودہ می شد، لیکن از بسکہ نفس عالی حضرت ایشاں برکمال مشابہت جناب رسالت مآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در بدوِ فطرت مخلوق شدہ بناءً علیہ لوحِ فطرتِ ایشاں از نقوشِ علوم رسمیہ وراہ دانشمندان کلام و تقریر و تحریر مصفی ماندہ بود۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ (دیباچہ صراط مستقیم: ص ۴)

بتایئے، کیا مولانا شہید بھی دھوکا دے رہے ہیں۔؟

اب ایک آخری جملہ ملاحظہ ہو، حزب ولی اللہ کا پہلا دور ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعۂ بالاکوٹ پر امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کی اجتماعی تحریک کا ایک دَور ختم ہوگیا لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دینا چاہتا ہے، وہ پہلے امیر شہید کی عظمت پر زور دے کر ان کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتا ہے۔ اس کے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیز کا دخل تھا اور نہ امام ولی اللہ کا اور نہ پشاور کی حکومتِ موقتہ کو دہلی میں مولانا محمد اسحاق کی امامت یا صدارت سے (جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ دار تھی)

کوئی تعلق تھا، اس کے بعد وہ آسانی سے امیر کی شہادت سے تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال لیتے ہیں"،
(ص ۱۷۵)

(الف) "چالاک تاریخ نویس" مشہد بالاکوٹ کو تحریک کا خاتمہ اس معنی میں قرار دیتا ہے کہ احیائے نظامِ خلافتِ راشدہ (حکومت دہلی کی تجدید نہیں)، کی ایک منظم اور ہمہ گیر کوشش جو حضرت سید شہید کی قیادت میں ہو رہی تھی، ظاہراً ناکام رہی اور فوری طور پر اس نہج پر دوسری ہمہ گیر تحریک اٹھانے کی توقع بھی جاتی رہی۔ ورنہ سید شہید کے ماننے والے اس المناک واقعے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اسی مقصدِ عظیم کے لئے جان اور سر کی بازی لگاتے رہے اور آج بھی ایک جماعت آیۂ ربانی

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	"ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ	انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی
يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا.	نذر پوری کر چکے ہیں اور بعضے ان میں مشتاق ہیں
(الاحزاب: ۲۳)	اور انہوں نے ذرا تغیر تبدل نہیں کیا"

کی یاد تازہ کر رہی ہے:

کارِ تجدید کا سہرا کس کے سر ہے؟

(ب) امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیزؒ کی تجدیدی کوششوں کا کس نے انکار کیا؟ البتہ محققین امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیزؒ کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں اسلامی تجدید کا سہرا مجدد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) شاہ ولی اللہؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور مولانا اسمٰعیل شہید (ف ۱۲۴۶ھ) کے سر باندھتے ہیں، مولانا آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں مولانا شہیدؒ ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے[۱]۔ استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ[۲] حضرت مجدد سرہندی اور امام

---

[۱] راقم نے ایک مرتبہ (۱۹۵۳ء) میں مولانا آزاد سے عرض کیا کہ یہ مقامِ تجدید تو حضرت سید صاحب کا منصب ہے۔ مولانا شہیدؒ بہر حال ان کے مرید تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ "میرا تاثر یہی ہے"۔

[۲] طبع اول کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم زندہ تھے (ص - ی)

ولی اللہؒ کے بعد ؍ حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید دونوں بزرگوں کو "تجدید دین کی نئی تحریک کا امام سمجھتے ہیں"۔

"تیرھویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمدؒ بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی، یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی . . . "

(مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ)

ہندوستان میں اسلامی تجدید پر یہ مقدمہ بے مثال چیز ہے، لیکن اس میں کہیں شاہ عبدالعزیز صاحب کا نام مجدد یا مفکر کی حیثیت سے نہیں آیا۔ مولانا ابوالکلام اور کھل کر اپنے مخصوص انداز بیان میں رقمطراز ہیں

". . . . پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ . . . . . خود اس خاندانِ عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذہ علم و عمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے، . . . . . . بااین ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے کاموں میں رہ گئے یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا، لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن آیا؟ . . . " (ملاحظہ ہو تذکرہ، ص ۲۴۶ - ۲۴۴)

اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی اپنے مقالہ تجدید و احیائے دین (الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۸-۹۱) میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی امامت کا بالکل ذکر نہیں کرتے (البتہ ان کے حلقۂ تدریس کی عظمت کا شاندار الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں) اور ان دونوں شہیدوں کو شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تمہ سمجھتے ہیں۔

"یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا۔ جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور

ملفوظات اور شاہ شہید کے منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئے گی........

سیّد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) دونوں روحًا و معنًی ایک وجود رکھتے ہیں اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدّد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں......" ص ۹۱-۹۲

اب آپ بتائیں کہ وہ کون "چالاک تاریخ نویس" ہے جو اس سے زیادہ کچھ کہتا ہے؛ سیّد صاحبؒ کے تذکرہ نگار تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو ان کا پیر اور اُستاد تسلیم کرتے آئے ہیں۔

(ج) مولانا محمّد اسحاق صاحبؒ کی "امامت اور امارتِ مطلقہ" البتہ ہمیں تسلیم نہیں۔ ہم انہیں درس گاہ ولی اللّٰہی کا جانشین اور سیّد صاحبؒ کی جہادی سرگرمیوں میں معاون و مددگار مانتے ہیں۔ اس سے زیادہ کہیے تو ہم آپ ہی کی اصطلاح اور زبان میں حکومت موقتہ کا "وکیل" مان لیں، روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان کے لئے "وکیل حکومت" ہی کا منصب تجویز کرتی ہے۔

(د) رہی "امیر شہید" کی عظمت اور اس پر زور دینے کا سوال، تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر آپ کے خیال میں یہ گناہ ہے تو "صدرِ شہید" اس راہ کے پہلے خطاوار ہیں۔ صراطِ مستقیم کے دیباچے میں مولانا شہیدؒ نے سیّد صاحبؒ کے نامِ نامی کے ساتھ تکریم و توصیف کے جو القاب استعمال کئے ہیں، ان سے زیادہ آج تک کسی عقیدت مند نے نہیں لکھا ہوگا۔

" امابعد میگوید...... بندۂ ضعیف محمّد اسمٰعیل کہ نعم الٰہی در بارہ ایں ضعیف نامتناہی است و از اعاظم آں حضورِ محفل ہدایت منزل ملازمان فخرِ خاندان سیادت مرجع اربابِ ہدایت مرکزِ دائرۂ ولایت دلیل سبیل فلاح و رشاد رہنمائے طریق استقامت و سداد، مظہرِ انوارِ نبوی منبع آثارِ مصطفوی، سلالۂ خاندان صلب طاہر سیّدالاولیا، اعنی علی مرتضی۔ نقادۂ دودمان سبط اکبر سند الاصفیا، اعنی حسن مجتبٰے۔ مقتدائے اصحاب شریعت، پیشوائے اربابِ طریقت، ہادی زمانہ مرشد یگانہ سراج المجبین، تاج المحبوبین الامام الاوحد السیّد احمد متع المسلمین بطول بقائہٖ و نفعنا و سائر الطالبین باقوالہ و احوالہ وایں ضعیف در اوان حضور آں مجلس ملائک انس

باستماعِ کلمات ہدایات آیات ۔ الخ الخ (صراطِ مستقیم ص ۸)

ابوالحسن علی ندوی (صاحب سیرت سید احمد شہید) تو بہرحال محتاط ہیں، مولوی جعفر تھانیسری جیسے عاشق صادق نے بھی تکریم و توصیف کے اتنے القاب نہیں استعمال کیے، ہمیں بتایا جائے کہ وہ کون "چالاک تاریخ نویس" ہے، جس نے مولانا شہید سے زیادہ سید صاحب کی عظمت پر زور دیا ہے؟

ایک ضروری وضاحت

راقم اوپر لکھ آیا ہے کہ سید صاحبؒ کی بیعت کے موقع پر شیخین (مولانا عبدالحیؒ اور مولینا اسماعیل شہیدؒ) موجود تھے۔ اب مزید چھان بین کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مولانا عبدالحیؒ ہجرت و جہاد میں سید صاحب کے ہمراہ نہیں جا سکے تھے۔ کسی خدمت کے سرانجام دینے کے لئے وہ ہندوستان ٹھہر گئے تھے (سیرت سید احمد شہید ص ۳۲۰۔۱) مولانا عبدالحیؒ جنگ سیدو کے بعد سوات بیز کے علاقہ میں سید صاحب سے ملے۔ (قبیل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ) ہجرت ۱۲۴۱ھ کے آغاز میں شروع ہوئی۔ اور بیعتِ شنجون حضرو کے بعد لی گئی (۱۲ جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ، سوانح احمدی ص ۱۰۵ و ص ۱۰۱) مولانا عبدالحیؒ کی وفات شعبان ۱۲۴۳ھ میں ہوئی۔

گویا مولانا عبدالحیؒ میدانِ جہاد میں سید صاحبؒ کے ساتھ آٹھ نو مہینے سے زیادہ نہیں رہے۔ اب اس قلیل عرصہ میں سید صاحبؒ پر کس قدر حاوی رہے ہوں گے؟ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ مولانا عبدالحیؒ گو بیعت میں شریک نہیں تھے لیکن سید صاحبؒ کی امارت میں اور ان کے جھنڈے کے نیچے برابر جہاد میں مصروف رہے، اور یہ وابستگی آخر دم تک قائم رہی، جیسا کہ سیرت سید احمد شہید سے معلوم ہوتا ہے (ص ۲۲-۳۱۵)

ناکامی کے اسباب؟

(۱) مولانا سندھیؒ نے سید صاحب پر استبداد بالرائے، ڈکٹیٹریت اور اس قسم کے دوسرے الزام لگائے ہیں، اور سید صاحب کی "انہی غلطیوں" کو ناکامی کا سبب قرار دیا ہے، ہم نے طوالت کے خوف سے ناکامی کے اسباب پر گفتگو نہیں کی۔ حاشیہ میں اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ

اتنا لکھ دیا ہے کہ ہم سید صاحبؒ کو معصوم نہیں کہتے۔ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ یہ صرف راقم کا خیال ہے ان کے "منقبت نگار" تو انہیں معصوم ہی کہتے آئے ہیں، اس شبہ کے دفعیہ کے لئے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کا یہ بیان کافی ہوگا۔

"بوجہ اپنی پاک باطنی اور صفائی قلب اور توکل و زہد اور اولوالعزمی کے اس بے نظیر بزرگ کو پولٹیکل پیچ پیدگیوں اور علم فن جنگ کی طرف بالکل توجہ نہ تھی۔ انہی دو نقصوں نے اس کام کو بگاڑ کر آخر اس کو بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا کہ جس کی یاد سے آج تک ہزاروں خلقت کے دل دُکھتے ہیں ۔۔۔۔۔" (سوانح احمدی ص ۱۳۹)

یہ دو نقص بھی ناکامی کے اسباب میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ناکامی کے وجوہ اس سے زیادہ گہرے ہیں، جن سے سید صاحب کے تذکرہ نگاروں نے (بہ شمول مولوی محمد جعفر تھانیسری و مولانا ابوالحسن علی ندوی) سیر حاصل بحث نہیں کی،

سیّد صاحب کے بارے میں مولانا گنگوہی کے تأثرات

ابھی ابھی مولانا سندھی کی اس شکایت کا ذکر آیا ہے کہ سید صاحب کے تذکرہ نگار ان کے کمالات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ حضرت شاہ عبدالعزیز سے ان کا سلسلہ منقطع ہو جائے، اور وہ تحریک کے "ماں باپ" ثابت ہوں" (ص ۱۷۵، ۱۴۴) ہم نے جواب میں عرض کیا کہ شکایت بے جا اور خلاف واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے سیّد صاحبؒ کے تلمذ اور ارادت کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ بلکہ اُسے سب فخریہ بیان کرتے آئے ہیں۔ پچھلے دنوں حسن اتفاق سے مولانا سندھی کے اُستاذ الاستاذ (اور اُستاذ بھی) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ) کے بعض تأثرات نظر سے گذرے جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ کی محبت و عقیدت میں انہیں حد درجہ غلو تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ حضرت سیّد شہید کے متعلق مولانا سندھی کے اُستاذ (اور ان کے حزب دہلوی کے امام) کے خیالات بھی ناظرین کے سامنے آجائیں۔ ملاحظہ ہو۔

مولانا حکیم سیّد عبدالحی (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا رشید احمد صاحبؒ کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"...... فرمایا کہ سب مشائخ طبیبِ اُمّت ہیں، اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے اعتبار سے طرق اُنہوں نے رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے، ...... بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کر دی تھیں، ان کے مجدد حضرت سیّد صاحبؒ ہوئے ...... پھر فرمایا کہ مجھ کو حضرت سیّد صاحبؒ کے ساتھ محبّت و عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھ کر ہیں۔ باقی خدا جانے کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں۔ یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں، اللہ تو ہی جانے میں مجبور ہوں[1] ......"

اس اقتباس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ محبت و عقیدت کا کوئی آئین نہیں ہوتا سید صاحب کے کسی تذکرہ نگار نے انھیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (ف ۱۲۳۹ھ) پر ترجیح نہیں دی لیکن مولانا رشید احمد جیسے ربّانی عالم انھیں حضرت شاہ صاحب سے بھی بڑھا رہے ہیں جب حزب دہلوی کے مرکز میں محبّت و عقیدت کا یہ انداز تھا تو پھر ایک مخصوص خطّہ یا خاندان کو موردِ عتاب بنانا کہاں تک بجا کہا جا سکتا ہے ؟

یہاں تک تذکرہ تھا حضرت سیّد صاحبؒ اور اُن کے رُفقاء کار کا اور مولانا سندھی کی تبویب کے مطابق حزبِ ولی اللہ کے دورِ اوّل کا۔

---

[1] ارمغانِ احباب۔ معارف جلد ۳۴۔ ص ۴۴۴

— ۲ —

صادقینِ صادق پور اور عاملینِ بالحدیث پر کرم فرمائیاں

حضرت سید شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا سندھی ان کے اہل حدیث رفیقوں اور اہل صادق پور کے زیادہ شاکی ہیں، عام اہل حدیث رفیقوں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ وہ افغان علاقے میں بھی عمل بالحدیث سے باز نہ آئے۔

"اب حزب ولی اللہ کی خصوصیات پر زور نہیں دیا جاتا، بلکہ نجدی و یمنی طریقوں پر کام کرتے والے ہندوستانی حنفی فقہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے جس سے افغانوں کو مجاہدین سے مذہبی عداوت پیدا ہو گئی۔ امیر شہیدؒ نے بارہا کوشش کر کے علماء افاغنہ اور عوام کو یقین دلایا کہ امیر اور ان کا خاندان ہمیشہ محققین حنفیہ کے طریقہ کا پابند رہا ہے۔ مگر حزب ولی اللہ کی امتیازی خصوصیات تسلیم نہ کرنے والے لوگ اس پابندی کو قبول نہ کرتے اور معاملہ روز بروز بگڑتا گیا۔" (ص ۱۵۹)

مصلحتِ وقت کے لحاظ سے ان عاملین بالحدیث کے 'اصرار' (اگر انہوں نے واقعی حضرت سید شہیدؒ کے سمجھانے کے باوجود عمل بالحدیث پر اصرار جاری رکھا) کے متعلق جو کچھ کہا جائے پر امام ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) کا نام لے کر تو ان پر زبان طعن کو دراز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو خاکہ بنایا تھا، اس پر سب سے پہلے خود ان کے پوتے ہی نے عمل درآمد شروع کر دیا تھا:

"جب مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے حجۃ اللہ امام عبدالعزیز سے پڑھی تو اپنے جد امجد کے طریقے پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی، جو "حجۃ اللہ البالغہ" پر عمل کرتے، اور وہ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ سنن پر عمل کرتے تھے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم ان پر اعتراض نہیں کر سکتا۔" (ص ۱۶۱)

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر آپ فقہ حنفی کی پابندی کو حزب ولی اللہ کی خصوصیات میں کیوں

داخل کرتے ہیں اگر کیا حضرت شاہ صاحبؒ کے مشرب کے مطابق ان جزئیات میں رواداری نہیں برتی جا سکتی؟

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی بابت ترک رفع الیدین کی روایت

اب صرف افغانی علاقے میں "عمل بالحدیث" کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ مولانا کی روایت ہے۔

"جب افغانی علاقے میں ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ تو امیر شہید نے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ رفع یدین کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا، رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے۔ امیر شہید نے کہا کہ مولانا! اب رضائے الٰہی کے لئے رفع یدین کرنا چھوڑ دیجئے۔ اس کے بعد مولانا شہید کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیئے۔"

(ص ۲-۱۶۱، بہ روایت امیر شاہ خاں مرحوم)

اولاً تو ہمیں اس شاذ روایت کے قبول کرنے میں تامل ہے[۱]۔ مولانا شہیدؒ کی تنویر العینین پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ تقلید کے دائرے سے نکل کر عمل بالحدیث کو اپنا شعار بنا چکے تھے۔ لیکن ہم صرف اس

---

[۱] ہندوستان میں اہل علم کی ایک بڑی جماعت امیر شاہ خاں کی اس روایت کو "افک و مین" قرار دیتی ہے۔ راقم نے صرف تامل ظاہر کیا ہے۔

ص۔ ی نواب صدیق حسن خانؒ نے "اتحاف النبلا" میں ایک فارسی فتویٰ بنام "تنقید الجواب" کا ذکر کیا ہے جو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے املا۔ کرایا تھا۔ یہ فتویٰ ایک حنفی عالم مولوی عبدالهادی کے فتوئ عدم جواز رفع الیدین کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔ اصل عبارت یہ ہے۔

"تنقید الجواب فتوئ فارسی عبارت است در جواب عدم جواز رفع الیدین فی الصلوٰۃ للشیخ المولوی عبدالهادی المهاجر الحنفی۔ از شیخ محمد اسمٰعیل بن عبدالغنی الشہید المتوفی سنۃ احدیٰ وخمسین ومائتین والف اولہ "الحمد للہ الذی لا شریک لہ فی الخلق والامر" وآخرہ املاہ محمد اسمٰعیل عفا اللہ عنہ" وبروی دستخط مولوی عبدالحی مرحوم است باین حرف هذا املاء کلہ صریح الحق والحق احق بالاتباع"۔ حررہ عبدالحی عفی عنہ شانزدہم ذی حجہ ۱۲۳۴ ہجری"۔ (اتحاف النبلاء ص ۴۴) نواب صاحب کی اس تصریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی طرف ترک رفع الیدین کی نسبت قطعاً غلط ہے۔

بنیاد پر روایت کی تکذیب نہیں کر سکتے، ہو سکتا ہے کہ اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے مصلحتِ وقت کی خاطر انہوں نے سید شہید کے مشورے سے رفع یدین وغیرہ ترک کر دیا ہو۔ یہ کوئی فرض و واجب کا سوال تو ہے نہیں، سنن و مستحبات میں عاملین و تارکین میں سے کسی کو بھی متشدد نہیں ہونا چاہیئے اور جہاں تک خاکسار کی حقیر معلومات کا تعلق ہے۔ امام ولی اللہ کا مسلک یہی تھا۔ امام ابن تیمیہ[۱] (ف ۷۲۸ھ) نے بھی اس پر بار بار زور دیا ہے۔

اہل حدیث علماء پر الزامات

لیکن حزب ولی اللہ کی تشکیلِ جدید کا دم بھرنے کے باوجود مولانا کا رویہ عاملین بالحدیث کے ساتھ منصفانہ نہیں، جس کی ایک جہاندیدہ وسیع النظر عالم سے توقع نہیں تھی، حیرت تو اس پر ہے کہ اس سلسلے میں غلط الزامات عائد کرنے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے، ملاحظہ ہو۔

"مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علما کے شاگرد تھے، باز نہ آئے، اور انہی لوگوں کے بےجا اصرار نے مشکلات پیدا کر دیں، امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو محمد اسماعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا۔ اپنی جماعت سے نکلوا دیا مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی" ۔

---

[۱] ملاحظہ ہو: فتاویٰ ابن تیمیہ جلد دوم ص ۲۸۷، ۳۰۵ - مطبعۃ کردستان العلمیہ۔
بات پر بات نکلتی ہے، امام ابن تیمیہ کی مناسبت سے مولانا سندھی کی ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ وہ ابن تیمیہ کے علم وفضل کے تو مداح ہیں، لیکن ان کے خیال میں امام کے لطیف نکتے اہل ہند کے دماغوں میں نہیں اتر سکتے، یعنی یونانی خرافات اور متکلمین کی پُر پیچ باتیں تو یہ خوب سمجھ سکتے ہیں لیکن قرآن وحدیث کی سادہ اور فطری سچائیاں ان کے ذہن و دماغ میں نہیں سما سکتیں اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہو سکتی ہے؟ معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو اچنبھا نہ ہوتا مولانا کے الفاظ یہ ہیں "ہمارے اہلحدیث بھائی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے دقیق مسائل سے حظ اٹھاتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ آیا یہ لطیف علوم ہندوستان کا متوسط طبقہ بہ آسانی قبول کر سکتا ہے؟ اس کے لئے عربی ذہنیت موزوں ہے" (ص ۹۹)

مولانا عبدالحق بنارسیؒ کی کردار کُشی

نجدی اور یمنی علماء پر اطمینان سے گفتگو ہوگی، یہاں خاکسار صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہے کہ اہلحدیث عالموں کے جس رہنما کو مولانا زیدی شیعہ کہتے ہیں، وہ شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی مہاجر مکی (ف ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ) ایک متبع سُنّت سلفی عالم ہیں، ان پر زیدیت اور شیعیت کا الزام عائد کرنا بڑا ظلم ہے۔ مولانا نے ان کا "ذکرِ خیر" مختلف جگہوں پر کیا ہے۔ دو موقعوں پر زیدی شیعہ، (ص ۹۵، ۱۶۲) اور ایک مقام پر نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) کا استاذ بھی بتایا گیا ہے لیکن نام لینے سے احتراز رہا ہے۔ صرف ایک جگہ کتاب التمہید کے اقتباس میں ان کا نام آتا ہے۔

"..... وانضم الیہ الشیخ عبدالحق بن فضل اللہ البنارسی الذی ینتسب الی الصدر الشہید واخذ عن الامام الشوکانی (ص ۱۹۱)	"اور ان کے ساتھ (یعنی مولانا ولایت علی کے ساتھ) شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی مل گئے، جو مولانا اسماعیل شہید (صدر شہید) سے انتساب رکھتے ہیں، اور امام شوکانی کے (بھی) شاگرد ہیں"

یہی مضمون دوسری جگہ ایک اضافے کے ساتھ یوں ادا ہوتا ہے۔

"جس ہندوستانی عالم کو (جو مذہباً زیدی شیعہ تھا) امیر شہید نے اپنی جماعت سے نکلوا دیا تھا' وہ بھی مولانا ولایت علی کے ساتھ شامل ہوگیا۔ نواب صدیق حسن خان اسی اُستاد کے واسطے سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں"..... (ص ۱۹۵)

ہمیں نہیں معلوم کہ امیر شہید نے انہیں کب جماعت سے نکلوا دیا تھا، کیا اس کا کوئی مستند ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔؟

اب رہا شیخ عبدالحق بن فضل اللہ پر زیدیت اور شیعیت کا الزام اس کی حیثیت ایک بہتان سے زیادہ نہیں۔ دیکھیے کہیں "مرغ قبلہ نما" تو آپ کی ناوک افگنی کا نشانہ نہیں بن رہا ہے۔

مولانا عبدالحق بنارسیؒ کی شخصیت

"مولانا عبدالحق بنارسیؒ (۱۲۰۶ھ ، ۱۲۷۶ھ[1]) علماء اہل حدیث اور شاہ اسماعیل و مولینا عبدالحیؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ طلب حدیث کے شوق میں سفر کیا۔ اور قاضی محمد بن علی شوکانیؒ، عبدالرحمٰن بن احمد بن الحسن البہکلی، شیخ عبداللہ بن محمد بن اسمٰعیل الامیر الیمانی اور شیخ محمد عابد بن احمد علی السندی سے استفادہ کیا، اور حدیث کی عام اجازت حاصل کی۔"

(سیرت سید احمد شہید، طبع دوم ص ۴۰۴ بحوالہ نزہتہ الخواطر قلمی)

تاریخی نام "فضلِ رسول" اور تاریخِ وفات "فضلِ رسول" آپ کے والد بزرگوار نیوتنی سے ترکِ اقامت فرما کر بنارس میں قیام پذیر ہوئے، اور یہیں کے ہو رہے ...... جیسے اُستاذ اور ہم سبق آپ کو ملے، کب کسی کو نصیب ہوں گے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں شہید علیہ الرحمۃ کے شریک سبق ہو کر حدیث پڑھ رہے ہیں۔ امیر المؤمنین (حضرت سید احمدؒ مرحوم) اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ایسے قطبین کے ہمراہ زیارتِ حرمین سے مشرف اندوز ہوتے ہیں۔ دہلی سے تکمیل کے بعد یمن جا کر امام محمد بن (علی) قاضی شوکانی سے حدیث پڑھ رہے ہیں۔ سند و اجازہ بنفسہ امام شوکانیؒ سے حاصل ہے ...... جن کے درس میں قاضی شیخ محمد مچھلی شہریؒ[2] اور مولانا قاضی سید جلال الدینؒ[3] بنارسی ایسے اعلام محدث ہوں۔ اس درس کی شہرت اور وسعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، ......

(تراجم علمائے حدیث، ہند ص ۴۴۴)

---

[1] ان کی وفات ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ غالباً یہ کتابت یا طباعت کی غلطی ہے۔

[2] (م ۱۲۵۲ھ ف ۱۳۲۴ھ) تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۴۴-۳۴۳۔

[3] (م ۱۲۲۱ھ۔ ف ۱۲۷۹ھ) تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۴۶-۳۴۵۔

مولانا عبدالحق کی مظلومیت

یہ تو اپنوں کی روایت تھی، اب ذرا تفریح کے لیے غیروں کی بنائی ہوئی کہانی بھی سنیے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ شیخ عبدالحق کی مظلومیت کوئی نئی نہیں۔ اپنے شیخ حضرت سید شہیدؒ اور اُستاذ مولانا شہید کی طرح یہ بھی غیروں کے حلقے میں نیک نام نہیں، جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما مسٹر اوکنلے (JAMES OKINLEY) مولانا ولایت علی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:۔

"ایک عالم کی حیثیت سے نمودار ہونے سے پہلے یہ (مولانا ولایت علی) بنارس کے ایک متعصب وہابی عبدالحق کے مرید ہوگئے تھے۔ اس شخص کا اصلی نام غلام رسول (؟)، تھا لیکن وہابی تعلیمات اختیار کرنے کے بعد اس نے یہ غیر مذہبی نام ترک کر دیا۔ اور عبدالحق نام اختیار کیا۔ اس کے بعد یہ مکہ گیا، جہاں اس کے "بدعانہ" خیالات کی خبر ترکی حکام کو ہوئی۔ گرفتاری کا حکم صادر ہوا۔ لیکن یہ کسی طرح نجد پہنچ گیا (؟) چند سال نجد میں رہ کر یہ بنارس واپس ہوا۔ جہاں یہ شیخ نجدی کے نام سے مشہور تھا۔ مولوی ولایت علی اس کے اولین حلقہ بگوشوں (CONVERTS) میں تھے"۔

ایک دوسرے صاحب اسی میں نمک مرچ لگا کر یُوں خامہ فرسا ہیں:۔

"ایک بات اور بھی ہے، جس میں ہندوستانی وہابی اپنے عرب بھائیوں سے الگ ہیں، یعنی یہ کہ سید احمد امام مہدی ہیں (؟) ولایت علی (عبدالحق کا ایک مرید نجد ہی میں وہابی ہوچکا تھا، لیکن بنارس میں رہتا تھا) نے اس عقیدے کی تبلیغ کی، اور اس پر ایک کتاب بھی لکھی" (؟)

ؔ اوکنلے کا مقالہ: "THE WAHABIS IN INDIA" مندرجہ کلکتہ ریویو ۵۱ ۔ ۱۸۷۰ء۔
مولانا ولایت علی شیخ عبدالحق کے مرید یا شاگرد نہیں تھے، البتہ دونوں ایک اُستاذ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) کے شاگرد اور ایک شیخ (حضرت سید احمد شہیدؒ) کے مُرید تھے۔

ؔ E. REHATOCK کا مضمون (THE HISTORY OF THE WAHABYS IN ARABIA AND IN INDIA) مندرجہ جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی جلد ۱۴ (۱۸۸۰ء) ص ۳۶۱

مولانا عبدالحقؒ کی اپنی تصریحات

اپنوں کی روایت کے ساتھ آپ نے غیروں کی "تلبیس" بھی دیکھ لی۔ اب خود شیخ عبدالحق کی زبانی ان کے حالات و خیالات معلوم کیجئے، نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) کو روایت حدیث کی اجازت دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"...... وبعد فان الشیخ الفطن .... مولانا السیّد صدیق حسن نجل مولانا السیّد اولاد حسن المحدّث القنوجی ...... طلب منی اجازۃ عامۃ و مثلی منہ یطلب ولست باھل ان اجاز فکیف ان اجیز ولکن الحقائق قد تخفی وقد منّ اللہ تعالےٰ علیّ بالمثول عند ائمۃ السنۃ النبویۃ والسماع منھم للآثار والاحادیث المصطفویّۃ و اخذ الاجازات عنھم فاولھم واجلھم الامام الھمام فخر الاسلام العالم الربانی مولانا قاضی محمد بن علی الشوکانی ...[1]

(حامداً و مصلیاً) مولانا سیّد اولاد حسن محدّث قنوجی کے صاحبزادے فاضل لبیب مولانا صدیق حسن نے مجھ سے (روایت حدیث کی) عام اجازت مانگی۔ حالانکہ مجھ جیسا آدمی ان سے اجازت طلب کرتا، اور میں تو اجازت دیئے جانے کا بھی اہل نہیں چہ جائیکہ (میں خود) اجازت دوں۔ لیکن بعض اوقات اصلیت چھپ جاتی ہے اور اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے حقیر کو ائمہ سنّت نبوی کی خدمت میں حاضری، ان سے حدیثیں سننے اور اجازتیں حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سب سے اوّل اور مقدم عالم ربانی، فخر اسلام امام اجل مولانا قاضی محمد بن علی شوکانی ہیں ....

---

[1] اس کے بعد اپنے دوسرے شیوخ یمن و حجاز کے نام لئے ہیں جن میں امام عبداللہ بن محمد اسماعیل الامیر (ف ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن بہکلی (ف سنہ) زیادہ ممتاز ہیں (تفصیل کے لئے اتحاف النبلاء، صـ ۲۶۴)

وقرأتُ اکثر کتب الحدیث
علی اسوة المحدّثین وارث
علوم سید المرسلین العلامة
النبیل مولانا شیخ محمد اسماعیل
الشهید تغمده الله بغفرانه
المدید وعلی شیخی[1] و مرشدی
مولانا الشاه عبد القادر اعلی الله
درجاته وخصّه بها و علی اکمل
العلماء و افقه الفقهاء قدوة
المحدّثین عمدة الکاملین
الشیخ العلامة مولانا شاه
عبد العزیز الدهلوی قدّس الله
سره بلطفه الخفی والجلی.....
واوصیه بتقوی الله عزّ وجلّ
واتباع الحق اینما کان و
مع من کان والعمل بصحیح
السنّة ومجانبة البدعة
والاستقامة علی قدم الحق
والصدق . . . . قاله بفمه
وحرره بقلمه خادم السنّة

میں نے حدیث کی اکثر کتابیں
علومِ نبوی کے وارث، اسوۂ
محدّثین، علامہ جلیل مولانا شیخ
محمّد اسماعیل شہید (تغمدہ
اللہ بغفرانہ المدید) اور
اپنے شیخ و مرشد مولانا
شاہ عبدالقادر (اعلی اللہ
درجاتہ وخص بھا) اور
علماء و فقہاء کے سرتاج،
محدّثین و کاملین کے سرخیل
مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی
(قدس اللہ سرہ بلطفہ الخفی
والجلی) سے پڑھیں . . . .
. . . . . اور میں انہیں تقوائے
الٰہی کے ساتھ ساتھ اتباعِ حق
کی نصیحت کرتا ہوں۔ حق جہاں
بھی ہو، اور جس کے ساتھ بھی ہو
(اس کی اتباع کرنا چاہیئے (اسی طرح)
صحیح سنت پر عمل کرنے، بدعت
سے بچنے اور حق و صداقت کی راہ

---

[1] شیخی و مرشدی کے فقرے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب (ف ۱۲۴۳ھ) سے بیعت تھے، مصنّف سیرت سیّد احمد شہیدؒ نے انہیں سید صاحب کے خلفاء میں شمار کیا ہے (ص ۴۰۴)

النبوية عبد الحق المحمدي....	پر ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرتا ہوں،
فی سلخ رجب سنة خمس و	.... یہ سب کچھ سُنّتِ نبوی کے خدمتگذار
ثمانین و مائتین و الف	عبدالحق محمدی نے اپنی زبان سے کہا اور (یہ سطریں)
الهجرية ، (اتحاف النبلاء ص ۵-۲۶۴)	اپنے قلم سے لکھیں - مورخہ آخر (۲۹ یا ۳۰) رجب ۱۲۸۵ھ

کیا اس اجازت نامہ کے بعد بھی ان پر "زیدیت" اور "شیعیت" کا الزام رکھا جائے گا؟ اگر اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی تھی، تو اب دور ہو جانا چاہیے نجد و یمن کے مجتہد الفکر محقق سلفی عالموں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا کوئی جرم نہیں، اور عبدالحق بنارسی تو علمائے یمن سے پہلے اساطین خانوادہ ولی اللہ کے شاگرد اور کفش بردار ہیں۔ البتہ ان کی نظر ہندوستان تک محدود نہیں اور اس طرح پر وہ مولانا سندھی کی اصطلاح میں انٹرنیشنلسٹ ہیں، اور ہمارے مولانا کے ہاں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہے

لے مولانا فرماتے ہیں ؛.... اس طرح حزب ولی اللہ کو ایک نیشنل پارٹی سمجھنا چاہیے جو انٹرنیشنل رجحان رکھتی ہے، اور ان ہندوستانیوں کو جو نجدی یمنی ذہنیت رکھتے ہیں ، ایسی پارٹی سمجھنا چاہیے ، جو انٹرنیشنل نقطہ نظر کو اساس قرار دیتی ہے ، (ص ۱۶۳) .... مثلاً روس میں ٹروٹسکی کی جماعت انٹرنیشنل نظریہ رکھتی ہے ، واضح رہے کہ ٹروٹسکی یہودی النسل ہے اس کے مقابلہ میں اسٹالن جو خالص روسی ہے ، کی جماعت انٹرنیشنل میلان رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ سٹالین نے ٹروٹسکی کی ساری جماعت کو جو عموماً یہودی تھی ، قتل کرا دیا ، اسی طرح اسلام ایک انٹرنیشنل تحریک ہے اور عربی ترکی ایرانی ہندی (یہ سب نیشنل تحریکیں ہیں ، ایک عرب جو اسلامی میلان رکھتا ہے یا ایک ہندی جو اتحاد اسلام کی فکر رکھتا ہے تو یہ مثال ہوگی سٹالین کی ، اور ایک ایسا آدمی جو سوائے اتحاد اسلام کے اور کوئی چیز نہیں مانتا جیسے یمنی نجدی تحریکوں سے متاثر ہندوستانی ، یہ ہے مثال ٹروٹسکی کی ، کیونکہ وہ بجز اسلام کے سب چیزوں کو نہیں مانتے ۔ ہندوستانیت ، عربیت وغیرہ ان کے ہاں کوئی چیز نہیں ہے ۔ لہٰذا ان ہر دو جماعتوں میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے (حاشیہ ص ۳-۱۶۲) جی چاہتا تھا کہ ٹراٹسکی اور اسٹالن کی تشبیہ پر کچھ عرض کروں ، مگر طول کلام کے خوف سے رک گیا تو اب مولانا کی توجیہ کے مطابق ہمیں نجدی و یمنی تحریکوں سے متاثر ہندوستانیوں کی انٹرنیشنلزم ہی پسند ہے اور واقعی ہم اسلام کے سوا "سب چیزوں" کو نہیں مانتے اور ہمارے ہاں ہندوستانیت عربیت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے اب آپ چاہے اسٹالن کی طرح جلا وطن کر دیں یا پھانسی پر لٹکائیں ہم تو اسلام

امام شوکانیؒ پر زیدیّت کا الزام

بہرحال شیخ عبدالحق کی زیدیّت سے برارت کے لئے یہ اجازت نامہ کافی ہے، اگر کسی کو اس سے بھی اطمینان نہ ہو تو مزید ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن مولانا کا الزام خود قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۱ھ) پر ہے، وہ نیل الاوطار کے مصنّف کو زیدی ہی سمجھتے ہیں[۱]۔ اور اہل صادق پور کی فردِ جرم میں شوکانی سے تلمذ اور نجدی و یمنی تحریکوں سے ہم آہنگی بھی ہے، نجدی یمنی اور ہندوستانی تحریکوں کا باہمی تقابل ایک دلچسپ بحث ہے۔ اور مولانا سندھی نے ہندوستانی اور نجدی (اور اسی طرح ہندوستانی اور یمنی) تحریکوں کے فرق پر بڑی گہری اور نکتے کی باتیں کہی ہیں۔ البتہ وہ نجدی اور یمنی تحریکوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے نزدیک دونوں بالکل ایک ہیں، جہاں تک رُوح کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی تحریک جہاد و تجدید (یعنی حضرت سیّد صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک) اور نجد و یمن کی دعوت توحید میں کوئی فرق نہیں مولانا عبیداللہ سندھی جیسا وسیع النظر اور دقیقہ رس عالم تقویۃ الایمان (مولانا شہیدؒ) اور کتاب التوحید

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اور اتحادِ اسلام کی رٹ لگاتے ہی رہیں گے۔ یہ ایک "سخن گسترانہ" بات تھی جو "مقطع" کے بجائے حاشیے میں آگئی۔ ورنہ ہمیں مولانا کی اس تعبیر و توجیہ سے اتفاق نہیں۔

[۱] مولانا سندھی زیدیّت اور شیعیت کا ذکر ایک ساتھ اس انداز میں کرتے ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ زیدیت اور عام شیعیت (اثنا عشریت) میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، اور یہ اس لیے کہ عقیدہ غیبوبت (یعنی سیّد صاحبؒ کے عدمِ شہادت کا خیال) کا سلسلہ یمن اور شوکانیؒ سے ملایا جائے۔ حالانکہ زیدیّت اور اثنا عشریت میں بڑا فرق ہے۔ "امام منتظر" کا عقیدہ اثنا عشریت کا لازمی جزو ہے۔ زیدی تو حضرت زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (ش ۱۲۲ھ) کو مانتے ہیں اور امام غائب کے قائل نہیں۔ (الملل والنحل شہرستانی، ص ۱۱۸-۱۱۵ طبع یورپ) اس لئے بفرضِ محال امام شوکانی کو اگر زیدی مان بھی لیا جائے تو اس سے عقیدہ غیبوبت کا سلسلہ یمن اور شوکانی سے نہیں ملتا۔ سید صاحبؒ کی غیبوبت کا خیال ہندوستان ہی کے خاص حالات کی پیداوار ہے۔ یہ عام مجاہدین کی ایک لغزش تھی۔ مغربی تحقیق کرنے والوں کی طرح خواہ مخواہ باہر سے سلسلہ ملانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال غیبوبت کی بحث ابھی آگے آتی ہے، زیدیت و یمن کی بحث اپنی جگہ پر آئے گی۔

(شیخ محمد بن عبدالوہاب) کی تعلیمات میں صرف دو جزئی فرق نکال سکا ہے (ص ۷-۱۳۶) اسی طرح یمن کے سلفی عالم امام شوکانیؒ کی ارشاد الفحول فی تحقیق الحق من علم الاصول اور مولانا شہیدؒ کی اصولِ فقہ میں اجماع کی بحثیں ایک دوسرے سے مختلف نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔ اور مولانا سندھی نے اس اختلاف کو بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے (ص ۱۴۰-۱۳۸) اگر ان جزئی اختلافات کے باعث نجد و یمن اور ہندوستان کی تجدیدی تحریکیں ایک دوسرے سے الگ کہی جا سکتی ہیں۔ اور ان میں سے ایک کے لئے دوسرے کے ساتھ ارتباط قائم کرنا جرم قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر نجد و یمن کی تحریکوں کا ایک سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ نجد و ہند کی تحریکوں میں جتنا اختلاف ہے، اس سے کہیں زیادہ فرق علمائے نجد و یمن کے افکار میں ہے۔ جس کی تفصیل اس ضمنی بحث میں نہیں ہو سکتی، نجدی۔ یمنی اور ہندوستانی تحریکوں کا باہمی تقابل جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، ایک دلچسپ موضوعِ بحث ہے اور مستقل فرصت چاہتا ہے۔ آگے چل کر انشاء اللہ اس پر مفصل گفتگو ہوگی۔

مولانا ولایت علیؒ پر عائد کردہ الزامات کا تجزیہ

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم پھر اپنے موضوع پر آجاتے ہیں۔ سید صاحب، ان کے تذکرہ نگاروں اور شیخ عبدالحق بنارسیؒ کے بعد مولانا سندھی کو زیادہ شکایت مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) اور ان کے ہم مشرب اصحاب سے ہے۔ مولانا ولایت علی صادق پوری سے ہمارے مولانا خاص طور پر برافروختہ ہیں، اس کی وجہ خود ان کی زبان میں یہ ہے۔

"۔۔۔۔۔ کہ مولانا ولایت علی نے مولانا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنائی" (ص ۱۱۲)

گویا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اولاً خود سید صاحبؒ ہی کی بیعتِ امارت، مولانا محمد اسحاق کی امارتِ مطلقہ کے خلاف بغاوت تھی (جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے) اب سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں نے بھی اپنا سلسلہ الگ قائم رکھا، اور انہوں نے مولانا محمد اسحاق کی دھلوی پارٹی (حزب دہلوی) میں شرکت نہیں کی، اور اسی کو وہ "انشقاق جماعت" سے تعبیر کرتے ہیں:۔

۱۔ انشقاقِ جماعت کا بے سروپا الزام

"لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دہلی سے باہر جس قدر جماعتیں حزب ولی اللہ سے تعلق رکھتی

تیں، ان تمام جماعتوں نے الصدر الحمید کی رہنمائی پر اتفاق کر لیا تھا، بلکہ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ بالاکوٹ کی مصیبتِ عظمیٰ اپنے پیچھے اپنی مستقل یادگار چھوڑ گئی ہے۔ وہ ہے "انشقاق الجماعۃ" یعنی اس کے بعد حزب ولی اللہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا۔" (ص ۱۹۰-۱۸۹)

اس انشقاق کا ذکر دوسری جگہ ایسے انوکھے انداز میں ہوتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے پڑھئے اور جی چاہے تو مولانا کے طریقِ فکر کی داد دیجئے:۔

مشرقی مغربی ہند کی رقابت تاریخ میں قدیم سے چلی آتی ہے، چندربنسی، سورج بنسی خاندان اسی مغربیت اور مشرقیت کے دوسرے عنوان ہیں، ہمارا یہ خیال ہے، کہ رقابت مذکورہ بعد از اسلام بھی قائم رہی، اور امیر شہید کے وقت میں بھی وہ بروئے کار آئی، امیر شہید مشرقی ہند رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں ان کے عامہ مریدینؔ[1] بھی بہار وغیرہ کے ہیں، اس کے بالمقابل مغرب یعنی دہلی ہے، وہ لوگ دہلوی تحریک کو اپنا بنانا چاہتے ہیں، اسی لیے مولانا ولایت علی بہاری نے مولانا اسحاق کے خلاف دوسری جماعت تیار کی، وہ مولانا اسحاق اور حزبِ دہلوی کو اس میدان سے دُور ہٹانا چاہتے ہیں۔ (ص ۶-۱۵۵ حاشیہ)

ذہانت کا کرشمہ

ذہانت بھی عجیب چیز ہے، مولانا عبید اللہ کی ذہانت کی تعریفیں سنا کرتا تھا، آج اس کا مشاہدہ

---

[1] ہر ہر بات کی کہاں تک تردید کی جائے، لیکن مولانا کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سید صاحبؒ کے اثرات پورب ہی کے علاقوں میں محدود تھے یا یہ کہ پچھم کے عوام و خواص پر ان کا اثر بہت کم تھا، حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے عقیدت مندوں کا حلقہ پورب اور پچھم کو یکساں محیط تھا، دہلی، سہارنپور، مظفر نگر وغیرہ تو ان کے عقیدتمندوں کا مرکز تھے۔

(ملاحظہ ہو: ارمغانِ احباب از مولانا حکیم سید عبد الحئیؒ: معارف جنوری، جون ۱۹۳۶ء)

ہوا، کہاں چندر بنسی اور سورج بنسی رقابت؟ کہاں سید شہید کے خلیفۂ خاص اور مولانا شہید وقاضی شوکانی کے شاگرد مولانا ولایت علی صادق پوری؟؟ یہ ذہانت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اولاً تو پارٹی بنانے اور "انشقاقِ جماعت" کا الزام بے بنیاد ہے، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مولانا محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) اور مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف مان بھی لیا جائے تو اس سے چندر بنسی اور سورج بنسی، دہلی اور بہار، پچھم اور پورب کی رقابت کہاں ثابت ہوتی ہے، یہ نسل اور زمین کی عصبیت تو ان بزرگوں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی ہوگی، بات صرف اتنی ہے، کہ جب اُمت کی سرسبز اُمیدیں بالاکوٹ کی سرزمین میں دفن ہوگئیں، اور چھوٹے بڑے سب پر نا اُمیدی چھا گئی۔ اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور ساری جماعت تتر بتر ہو رہی تھی، ایسے نازک وقت میں مولانا ولایت علی صادق پوری (جو سید صاحبؒ کے خاص خلفاء میں تھے، اور انہی کے حکم سے ایک تبلیغی مہم پر دکن گئے ہوئے تھے) نے گرتے ہوئے عَلَم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور مرتے دم تک سید شہیدؒ کی مہم کو چلاتے رہے۔ اُن کے بعد ان کے عزیزوں، رشتہ داروں، بھائیوں، بیٹوں، اور عام ماننے والوں نے جہاد فی سبیل اللہ کی مہم جاری رکھی، اور اس کی ان کے خاندان والوں نے اتنی گراں قیمت ادا کی، اور ایسی قربانیاں پیش کیں، جن کا نمونہ ہندوستان کی کوئی اسلامی یا غیر اسلامی تحریک نہیں پیش کر سکتی، بس مولانا ولایت علی کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے سید صاحبؒ کی شہادت کی خبر سنتے ہی دکن سے وطن کا رخ کیا، اور مجاہدین کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے جوڑنے اور بکھرے ہوئے شیرازے کی تنظیم میں مصروف ہوگئے (۱۲۴۸ھ) اب اسے پارٹی بازی کہیے یا انشقاقِ جماعت، آپ کو اختیار ہے، ہم اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا محمد اسحاق گیارہ بارہ سال ہندوستان میں رہے (ہجرت: ۱۲۵۸ھ) اور مولانا ولایت علی کی سرگرمیوں کے خلاف ان کی زبان سے کبھی ایک حرف نہیں نکلا۔

نیز مولانا سندھی ہی کا ارشاد یہ بھی ہے کہ مولانا محمد اسحاق نے ۱۲۵۷ھ کے لگ بھگ اپنا نیا پروگرام مرتب کیا،

> "الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال کے غور و فکر سے امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کر لیا (ص ۷۷)

اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا ولایت علی نے ۱۲۴۸ھ میں اپنے ماننے والوں سے

سے از سر نو جہاد کی بیعت لی[1]، تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مولانا ولایت علی ۱۲۴۸ھ سے ۱۲۵۷ھ تک اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور مولانا محمد اسحاق کم از کم اس سے ناخوش نہیں تھے اور اس وقت تک منظم طور پر وہ خود کوئی تحریک نہیں چلا رہے تھے، بلکہ ہمارے پاس اس کا ثبوت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے[2]۔

مزید برآں ہمارے مولانا اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حزب دہلوی اور حزب صادق پوری کی تفریق مولانا محمد اسحاق کی وفات کے بعد ہوئی۔

ثم هاجر الشيخ الى الحجاز فتوفى	"تو شیخ حجاز ہجرت کر گئے اور مکہ مکرمہ میں
فى مكة سنة ۱۲۶۲ و بعد ما	وفات پائی (۱۲۶۲ھ) اور ان کی وفات
توفى ظهر فى المنتسبين الى الطريقة	کے بعد طریقۂ ولی اللٰہی پر چلنے والے
الولى اللهية الطائفتان الحزب	دو فرقوں میں بٹ گئے، حزب دہلوی
الدهلوى والحزب الصادق پورى	اور حزب صادق پوری"۔

(ص ۱۹۱)

تو پھر ان شہادتوں کی موجودگی میں مولانا ولایت علیؒ پر مولانا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنانے کا الزام کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے؟

---

[1] والامير ولايت على انضم اليه عامة الشرقيين من البهار (؟) و بنغاله (؟) فأم الى تجديد بيعة الجهاد بمحل اقامته صادق پور سنة ۱۲۴۸ (ص ۱۹۱)

[2] مولانا ولایت علی کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم صادق پوری (مولود ۱۲۵۲ھ، متوفی ۱۳۴۱ھ) تذکرۂ صادقہ میں رقمطراز ہیں۔

"جناب مولانا ولایت علی نے شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نبیرۂ مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ دہلوی کی خدمت میں ترجمۂ قرآن از شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور رسائل مولانا اسماعیل شہید کے ارسال کی درخواست کی اور جناب شاہ صاحبؒ کے ارسال فرمانے پر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کے طبع کرانے کی سعی فرمایا، بعد انکار صاحب مطبع آپ نے زمانہ دورہ و سیر بنگال کے اس خدمت طبع کو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزمان صاحب بردوانی کے حوالہ فرمایا چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے ایک ٹائپ پریس قیمتی و سنہر خرید کر کے بکرات و مرات تعمیل ارشاد کیا ......" (ص ۱۰۶)

اُوپر کی تفصیل سے کم سے کم یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مولانا ولایت علیؒ نے مولانا اسحاقؒ کے مقابلے میں کوئی پارٹی نہیں بنائی۔ لیکن ہمارے مولانا صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے، وہ مولانا محمد اسحاقؒ سے لے کر مولانا شیخ الہندؒ تک مختلف عُلماء و مشائخ کی مسلسل امامت و امارت ثابت کرنے کے لئے اہلِ صادق پور پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں، اور کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ امام ولی اللہ دہلوی کے طریقے سے ہٹ گئے تھے، ان پر نجد کی وہابیّت اور یمن کی زیدیّت اثر انداز ہو گئی تھی، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی حکمت کے اصلی وارث اور ان کی راہ پر ٹھیک ٹھیک چلنے والے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے شیُوخ (اساتذہ) ہیں۔ ہمیں ان شیوخ[1] کے علم و فضل، تقوٰے و صلاح اور خدمات کا پورا پورا اعتراف ہے، اور یہ بہت ممکن ہے کہ ان حضرات کی سیاسی پالیسی صادق پُوریوں اور سیّد شہید کے عام ماننے والوں سے مختلف رہی ہو، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ حق و رشد کا انحصار انہی شیوخ میں ہے، اور ہندوستان میں دینی اصلاح انہی کی ذات کے ساتھ وابستہ رہی، اور یہ کہنا یا سمجھنا کہ ان شیوخ کے دامنِ شفقت سے جو وابستہ نہ ہوا، اس پر ہدایت کی راہ بند ہو گئی۔ ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

سلسلۂ کلام دراز ہوتا جا رہا ہے، خاکسار یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (ف ۱۱۷۶ھ) کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کے خاندان میں نظر و فکر کے دو مختلف رجحان نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تو فقہ حنفی اور شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ لیکن شاہ عبد العزیز صاحب فقہ حنفی سے متقید نظر آتے ہیں[2]۔ اور شاہ عبد العزیز صاحب (ف ۱۲۳۹ھ)

---

[1] شاہ محمد اسحاق صاحب (ف ۱۲۶۲ھ) کے شاگرد حاجی امداد اللہ صاحب (ف ۱۳۱۷ھ) ان کے شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (ف ۱۲۹۷ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ) اور ان تینوں کے شاگرد اور جانشین (ص ۱۸۶) مولانا محمود الحسن شیخ الہند (ف ۱۳۳۹ھ) اور مولانا شیخ الہند کے شاگردِ رشید مولانا عبید اللہ سندھی۔ گو مولانا کو مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تلمّذ حاصل ہے (ص ۱۸۸)

[2] واضح رہے کہ شاہ ولی اللہ کا مخاطب اعلیٰ طبقہ ہے۔ وہ تمام دنیا میں ایک ہی رنگ رکھتا ہے۔ اس لئے ان کی باتیں دوسرے ممالک میں اسی طرح مانی جا سکتی ہیں۔ جیسے ہندوستان میں، مگر شاہ عبد العزیز (باقی اگلے صفحہ پر)

کی زندگی ہی میں مولانا اسمٰعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ) نے عمل بالحدیث کی طرح ڈال دی تھی، اور دادا کے بنائے ہوئے خاکے میں ہونہار پوتے نے رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا، اور پھر تکیہ رائے بریلی کے سید زادے کی صحبت نے تو ان کے نظر و فکر کی دنیا ہی بدل دی، دوسری طرف شاہ عبد العزیز صاحب کے نواسے مولانا محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) ہیں، جن کے پروگرام میں مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حنفی مذہب کی پابندی شامل ہے ؛۔

الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال غور و فکر سے امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کر لیا، ان کے پروگرام کے دو اصول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں

(الف) حنفی مذہب کی پابندی

(ب) اور ترکی سلطنت سے اتصال (ص ۸۷)

کون نہیں جانتا کہ مولانا شہید کی روش یہ نہیں تھی[1] مولانا خود فرما چکے ہیں[2] کہ مولانا شہیدؒ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعلیٰ طبقہ کو چھوڑ کر متوسط اور عوام کو مخاطب بنا کر وہی عالی علوم ان تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ یہ علوم راسخ ہو سکیں، ظاہر ہے کہ متوسط طبقہ ہر ملک کا جدا جدا ہوتا ہے تو اب جو خصوصیات امام عبد العزیز کے طریقے میں موجود ہیں، وہ صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے ہیں۔ علمی طور پر ان کو اس بلند فکری سے نیچے اترنے کی، خود اپنی طبیعت کی رو سے، نیز اپنے خصوصی ماحول (مثلاً خاندان تلامذہ و اولاد) کے رو سے کوئی ضرورت نہیں۔

اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ فقہ حنفی اور شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ اور شاہ عبد العزیز فقط فقہ حنفی سے مقید ہیں" (ص ۷۷، حاشیہ)

[1] فرماتے ہیں:۔

ولیت شعری کیف یجوز التزام تقلید شخص معین مع تمکن الرجوع الی الروایات المنقولۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصریحۃ الدالۃ خلاف قول الامام المقلد الخ (تنویر العینین)

"اور معلوم نہیں ایک شخص معین کی تقلید کا التزام کس طرح جائز ہو سکتا ہے جبکہ ایسی مرفوع (رسول اللہ سے منقول) روایتوں کی طرف رجوع ممکن ہے (یا ہو) جو اس امام خاص کے قول کے خلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں"۔ الخ

[2] ابھی یہ پورا ٹکڑا اوپر شیخ عبد الحق کے سلسلے میں نقل ہو چکا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی تھی، جو آمین بالجہر اور رفع یدین و سُنن پر عمل کرتی تھی (اسی قسم کی ایک روایت آگے بھی آتی ہے)

تو کہنا یہ ہے کہ مولانا ولایت علی صادق پوری شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مسلک سے ہٹے نہیں تھے، البتہ ولی اللّٰہیوں میں مولانا شہیدؒ سے زیادہ متاثر ہیں۔ اور ان کے شاگرد بھی ہیں، اور ان کی "خاص جماعت" کے وہ رکن بھی تھے۔ خود مولانا سندھی کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

"...... رائے بریلی میں مولانا شہیدؒ سے حدیث پڑھتے، اور آپ کی جماعت کے نائب تھے۔" (ص ۱۱۴ بحوالہ سیرت سید احمد شہیدؒ)

ومولانا ولایت علی کان من	(مولانا ولایت علی صدر شہید کے
عظماء خواص اصحاب الصدر	اخص ترین اصحاب میں سے تھے، اور
الشہید وکان الامیر الشہید	امیر شہید انہیں جہاد کا داعی بنا کر
یرسلہ داعیا الی الجہاد فی الھند'	ہندوستان بھیجتے تھے)

مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد فقط حجۃ اللہ پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی جو رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتی تھی، مگر امیر شہید کے سمجھانے سے مصلحت عامہ کے لیے وہ جماعت ختم کر دی گئی، مولانا ولایت علی اس جماعت کے ممبر تھے، اب وہ علیحدہ[1] ہو کر دراصل اس جماعت کا احیاء مقصد بتاتے ہیں۔ (ص ۱۹۲ حاشیہ)

پٹنہ کے مولانا ولایت علی مرحوم جو بالاکوٹ میں حاضر نہیں تھے، وہ مولانا اسماعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے، جو مولانا شہید نے دہلی میں امام ولی اللہ کی اتباع کے لیے بنائی تھی (ص ۱۹۴-۱۹۳)

مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق صدر حمید کا اصلاحی فکر قبول نہیں کیا، (ص ۱۹۴) اصلاحی فکر یعنی حنفی مذہب کی پابندی اور ترکوں سے اتصال، وہ حنفی مذہب کی پابندی کو حجۃ اللہ کے خلاف اور ترکوں سے اتصال کو یمنیوں اور نجدیوں کے خلاف جانتے تھے (ص ۱۹۴- حاشیہ)

---

[1] کس سے علیحدہ ہو کر؟ مولینا شہید تو اپنے شیخ کے ساتھ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرما چکے اب کون گیا جس کے ساتھ تھے، اور اب علیحدہ ہو رہے ہیں۔

یہ خود مولانا سندھی کے بیانات ہیں، ہمیں صرف یہ دکھانا تھا کہ مولانا ولایت علی پر انشقاق جماعت کا الزام غلط ہے۔ وہ ہمیشہ جادۂ ولی اللٰہی پر گامزن رہے۔ اور اپنے لازوال کارناموں سے وہ اپنے شیخ حضرت سید شہید اور استاد مولانا اسماعیل شہید کے سچے اور صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

مولانا ولایت علی صادق پوری اور اُن کے خاندان کی خدمات کا مختصر تذکرہ

یہاں تک تو صرف انشقاقِ جماعت پر گفتگو تھی۔ اب اس سلسلے کے دوسرے الزامات و مؤاخذات پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی صادق پوری کی خدمات ان کے مشن اور کام کی نوعیت پر مختصر سے مختصر طور پر کچھ صحیح معلومات بھی پیش کر دی جائیں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے اس اعتراض و جواب کا پس منظر سامنے آجائے۔

مولانا ولایت علی صاحب عظیم آباد ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے، مولوی فتح علی صاحب کے بیٹے اور رفیع الدین حسین خان صاحب کے نواسے تھے۔ جو صوبہ بہار کے ناظم و رئیس اور عمائدین سے تھے۔ آپ نانا کے بڑے لاڈلے تھے۔۔۔۔۔۔ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور تقریر سنی تو کیفیت بدل گئی۔ اب وہ عظیم آباد کے بانکے نوجوان نہ تھے، بلکہ سید صاحب کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے رائے بریلی میں مولانا اسماعیل صاحب شہید سے حدیث پڑھتے، اور آپ کی جماعت میں آپ کے نائب تھے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور سر پر لاد کر لاتے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے مٹی گارے کا کام کرتے،

سید صاحب کی جماعت میں آپ سے زیادہ مولانا اسماعیل صاحب شہید سے کوئی مشابہ نہ تھا، آپ سید صاحب کے رنگ میں ایسے رنگے، اور آپ کی محبت میں ایسے ڈوبے کہ اپنے سارے خاندان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا، اور سید صاحب کا مخلص اور جانباز سچا نام لیوا بنا دیا۔ سید صاحب کے بعد آپ ہی نے سب سے زیادہ آپ کی نیابت و جانشینی کا حق ادا کیا، اور آپ کے خاندان نے سید صاحب کی محبت کی سب سے گراں قیمت اور سب سے بھاری تاوان ادا کیا، آپ کی ترغیب سے خاندان کے سب مرد و زن خورد و کلاں، سید صاحب سے بیعت ہو گئے

تھے، سید صاحب حج کو تشریف لے گئے، تو آپ وطن میں نیابت انبیاء کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر سید صاحب کے ہمرکاب جہاد کے لیے تشریف لے گئے سید صاحب نے آپ کو کابل سفارت پر بھیجا،....... سوات سے سید صاحب نے آپ کو اور مولانا سید محمد علی[1] صاحب کو تبلیغ و اشاعت دین کے لیے ہندوستان روانہ فرمایا۔ مولانا ولایت علی پر آپ کی جدائی اور میدان جہاد سے علیحدگی بہت شاق تھی، سید صاحب نے آپ سے فرمایا کہ مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے ہیں، یعنی اس ایک تخم سے ہزاروں درخت پیدا ہوں گے، آپ وہاں سے بمبئی و حیدرآباد (دکن) آئے،...... آپ کو اسی اثناء میں بالاکوٹ کے حادثے کی اطلاع ہوئی سید صاحب کی خبر شہادت سے سارا بار آپ پر پڑ گیا،..... تمام ہندوستان میں سید صاحب کے حلقوں میں آپ کی شہادت سے ایک انتشار و پژمردگی چھائی ہوئی تھی،...... آپ نے بمطابق آیت وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم[2] سید صاحب کے کام کو سنبھالا، وطن پہنچ کر تبلیغ دین و تنظیم جماعت کا کام شروع کیا، لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی،...... آپ ہی کی کوششوں سے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمۂ قرآن اور شاہ اسماعیل صاحب کے رسائل (جو آپ نے شاہ اسحاق صاحب سے دہلی سے منگائے تھے) شائع ہوئے.... آپ نے اپنے شیخ اور ان کے مخصوص خلفاء کی طرح بیسیوں مردہ سنتیں زندہ کیں، اپنے ہاتھ سے خاندان میں متعدد بیواؤں کا نکاح کیا،..... دو برس کے بعد آپ راستہ میں وعظ و تبلیغ فرماتے ہوئے حج کو تشریف لے گئے، حج و زیارت سے فراغت کے بعد آپ یمن تشریف لے گئے اور نجد وغیرہ، مسقط، حضرموت کی سیر کی، اور قاضی محمد بن علی شوکانی سے حدیث کی سندلی، حج سے واپسی کے بعد مجاہدین کی طلب پر آپ نے اپنے بھائی مولوی عنایت علی صاحب کو گلاب سنگھ کے مقابلہ کے لئے سرحد بھیجا کچھ عرصہ کے بعد خود تشریف لے گئے،... گلاب سنگھ نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا اور ان کی حمایت حاصل کی، انگریزوں نے مفتوحہ

---

[1] مولانا محمد علی رامپوری (ف ۱۲۵۱ھ) سید صاحب کے چند ممتاز خلفاء میں تھے، حالات کے لئے سیرت احمد شہید (ص ۲۶۳ - ۲۵۸) اور سوانح احمدی (ص ۱۵۵ - ۱۵۰) کی طرف رجوع کیا سکتا ہے۔

[2] آل عمران ، ۱۳۸ (اور محمد نرے رسول ہی تو ہیں، آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے؟)

ملک میں غدر کرادیا اور آپ کے عمال قتل کر دیئے گئے، اس کے بعد آپ وطن لوٹنے پر مجبور کئے گئے لیکن انہیں واپسی کا بڑا رنج وملال تھا۔ آخر دو برس کے قیام کے بعد سمرستھانہ پہنچ گئے، اور وہیں محرم ۱۲۶۹ھ میں علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

مولانا علیہ الرحمۃ کا پورا خاندان صادق پور سید صاحبؒ کے سچے معتقدوں اور اسلام کے پکے مجاہدوں کا خاندان تھا، جس کا بچہ بچہ سید صاحبؒ کی محبت میں چُور اور اسلام کے لیے سربکف تھا، ان لوگوں نے فرداً فرداً اور بحثیت مجموعی سید صاحبؒ کی وفاداری اور اسلام کی جاں نثاری کا ایسا حق ادا کیا جس کی نظیر کسی دوسرے خاندان میں نہیں ملتی، مولانا عنایت علی غازی[1] مولانا فرحت حسین صاحب[2] مولانا احمد اللہ صاحبؒ[3]، مولانا یحییٰ علی صاحبؒ[4] میں سے ہر ایک اپنے وقت میں امام احمد بن حنبلؒ کا نمونہ تھا،...... یہ لوگ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ[5] کے پورے مصداق تھے، مقدمہ سازش[6] میں حکومت نے ان کے مکانات مسکونہ تک مسمار کر دیئے اور صادق پور کا وہ محلہ جہاں محل کھڑے تھے، کفِ دست میدان بنا کر اور مکانوں پر ہل چلوا کر میونسپلٹی کی عمارت بنوادی، جو آج تک قائم ہے، البتہ زلزلے کے بعد دوبارہ تعمیر ہوئی ہے، لیکن

ا۔ مولانا عنایت علی صاحب غازی (مولود ۱۲۰۷ھ یا ۱۲۱۱ھ) کی وفات سرحد پار (منگل تھانہ) ایسے روح فرسا حالات میں ہوئی، (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) کہ دشمن بھی سن کر آب دیدہ ہو جائے، کوئی مصیبت نہ تھی جو اس مرد غازی نے خوشی خوشی برداشت نہ کی ہو، (تذکرہ صادقہ ص ۱۴۰-۱۳۰) مولانا نے ان کے ابتلا ومحن کو بھی غلط معنی پہنائے ہیں، اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰهِ ممکن ہے آگے کسی سلسلے میں ذکر آجائے

۲۔ مولود ۱۲۲۲ھ متوفی ۱۲۷۱ھ، تفصیل کے لیے تذکرہ صادقہ (ص ۱۲۵-۱۲۱)

۳۔ اسیر انڈمان و متہم مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء، انڈمان ہی میں وفات پائی ۱۲۹۸ھ (تذکرہ صادقہ ص ۵۹-۱۴۴)

۴۔ اسیر انڈمان و متہم مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء، اسی زندان میں واصل بحق ہوئے ۱۲۸۴ھ (تذکرہ صادقہ ۸۷-۶۳)

۵۔ آل عمران ۱۹۵، (سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا، اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے میری راہ میں)

۶۔ مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء۔

تاریخ درج ہے) اور قدیم تعمیر کی ایک ایک یادگار اور ایک ایک نشان مٹا دیا، قبریں بھی مشتبہ کہہ کر کھود کر پھینک دی گئیں، حتیٰ کہ کھجور کا ایک درخت رہ گیا تھا، جو اس چمن خزاں دیدہ کی یادگار تھا، اس کو بھی اکھڑوا دیا،............

(سیرت سید احمد شہید ص ۳۶۳-۳۷۲ ملخص [۱])

۲- اِعتقادِ غیبوبت کا الزام

مولانا ولایت علی صادق پوری پر انشقاق جماعت کے بعد دوسرا الزام اعتقادِ غیبوبت کا ہے اور اسے مولانا سندھی نے بڑے شد و مد کے ساتھ اچھالا ہے، بلکہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ان کا مرکزی فکر یہی عقیدۂ غیبوبت تھا، اور اسی لئے وہ مولانا محمد اسحاق سے علیحدہ ہوئے، مولانا نے اس الزام کو بار بار دہرایا ہے، ہم صرف دو ایک اقتباس دیں گے،،۔

"(۱) واقعۂ بالاکوٹ میں بقیۃ السیف مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہیں ملا، اس کا اصلی سبب یہ تھا، کہ سکھوں نے امیر شہید کا سر کاٹنے کے بعد مقامی مسلمانوں کی معرفت فوجی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کرا دیا تھا،...... اس اضطراب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں، (ص ۱۹۲)

"(۲) بعض اتفاقی واقعات اس کے مؤید بن گئے، امیر شہید بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز پیشتر اپنے اصحاب کو وصیت کرتے رہے ہیں، کہ اگر بالفرض کسی ضرورت کے لیے ہم چند روز غائب ہو جائیں، تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں گے،"...... (ص ۱۹۳)

(۳) مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق صدر حمید کا اصلاحی فکر قبول نہیں کیا، اور اس روایت غیبوبت کی آڑ میں اپنی مستقل جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا،...... جس وقت الصدر الحمید دہلی سے حجاز پہنچ گئے، اس کے بعد مولانا ولایت علی

---

[۱] مزید تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو، تذکرۂ صادقہ (ص ۱۳۰-۱۱۰) اور سوانح احمدی (ص ۱۶۶-۱۵۵)

نے پٹنہ میں اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔ (ص ۱۹۴)

(۴) اس پارٹی کا مرکزی فکر یہی بتایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصے کے لئے غائب ہو گئے ہیں، ان کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیئے، وہ ضرور آئیں گے، اور انہی کی جماعت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے

(۵) بظاہر یہ فکر نہایت غیر معقول ہے، مگر بڑے بڑے عالموں اور صوفیوں کا جو حزب ولی اللہ سے اختصاص رکھتے ہیں، اس تحریک کی شمولیت میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے، اس لیے اس کی تاویل یہی ہو سکتی ہے، کہ عوام (نہ خواص) کو تحریک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے یہ ایک سیاسی چال تھی۔ (ص ۱۹۵)

پہلے دو ٹکڑے تمہیدی ہیں، ان سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں، تیسرے اقتباس میں کچھ اضافوں کے ساتھ "انشقاقِ جماعت" والے الزام کو دہرایا گیا ہے، اس میں ایک فقرہ (روایتِ غیبوبت کی آڑ میں) مولینا ولایت علی کی دیانت داری اور خلوص نیت پر ایسا بدنما حملہ ہے جس سے ہم مولینا سید اللہ کو اونچا دیکھنا چاہتے تھے، البتہ انشقاق جماعت کے متعلق ایک نئی بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا محمد اسحاقؒ کے حجاز پہنچنے (۱۲۵۸ھ) کے بعد مولانا ولایت علی نے اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔ اس کے متعلق دو حرف جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب کے ماننے والوں کی طرف سے "پارٹی" یا مستقل پارٹی کا اعلان کبھی نہیں ہوا۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا، رہی مولانا ولایت علی کی جہادی اور تنظیمی سرگرمیاں تو وہ دکن سے واپسی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں (۱۲۴۸ھ) اسی سال سید صاحب کے ماننے والوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی تجدید کی (جیسا کہ اوپر گذر چکا) اس تجدیدِ بیعت کے بعد مولانا اسحاق دس سال ہندوستان میں رہے، اور مولانا ولایت علی کی سرگرمیاں جاری تھیں، صرف پورب میں نہیں بلکہ سرحد پار بھی، تجدیدِ بیعت کے چند ہی سال بعد سید ضامن شاہ نے (جو گلاب سنگھ والئی کشمیر سے برسرِ پیکار تھا) آپ سے مدد طلب کی، آپ نے اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی کو بالاکوٹ بھیج دیا۔ اور وہ وہاں پہلے فتح یاب ہوئے (۱۲۵۴ھ، ۱۸۳۶ء) پھر خوانین کی غداری سے بے یار و مددگار ہو کر وطن واپس چلے آئے (تذکرۂ صادقہ ص ۱۳۶) تو کیا مولانا محمد اسحاق کو ان سرگرمیوں کی خبر نہیں تھی۔

پھر مولانا کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ مولانا اسحاقؒ کے حجاز پہنچنے کے بعد مولانا ولایت علیؒ نے اپنی پارٹی کا اعلان کر دیا؟ مولانا محمد اسحاق کی دہ سالہ (۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء تا ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء) خاموشی اور رضامندی سے شاید ہمارے مولانا اپنی کمزوری محسوس کرتے ہیں، اسی لیے انہوں نے "بعد از ہجرت" کا شاخسانہ لگایا اور شاید اسی لیے ایک دوسری جگہ وہ یہ بھی کہتے ہیں "کہ مولانا محمد اسحاقؒ کے احترام (اور خوف) سے وہ لوگ دہلی اور اس کے اطراف میں صاف صاف اپنی تبلیغ نہیں کرتے تھے [1]"

یہ دہلی اور اس کے اطراف کا کیا ذکر ہے۔؟ بنگال سے لے کر کشمیر، سندھ اور سرحد پار تک ان کے مبلغین سرگرم عمل تھے۔ وَمَا یَوْمُ حَلِیمَۃَ بِسِرٍّ (اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں)

اب مسئلہ غیوبت کو لیجیے جسے مولانا نے بار بار بڑے شد و مد کے ساتھ اچھالا ہے، حالانکہ یہ ایک وقتی چیز تھی، جس سے بعض طبیعتیں متاثر ہوگئی تھیں، اُسے "مرکزی فکر" کہنا یا دعوت کی اساس بتانا مبالغہ آرائی سے کام لینا ہے۔

بات اتنی ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت سے مجاہدین کے جی چھوٹ رہے تھے، کسی نے یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ "سیدنا، شہید نہیں ہوئے، غائب ہو گئے ہیں، تھکے ہارے اس پر یقین کر بیٹھے، اور کچھ دنوں تک اس کا غلغلہ رہا، بعد کو رفتہ رفتہ طبیعتیں سکون پر آئیں تو غلطی کا احساس ہوا، پھر اس میں صادق پور اور غیر صادق پور کی تفریق نہیں۔ سید صاحب کی غیوبت کے عقیدے کا ظہور ان کے محبین خاص کے متعلقوں میں ہوا، اہل صادق پور اس سے الگ نہیں تھے، اور یہ امر شدتِ محبت میں بہ کثرت ظاہر ہوتا ہے۔ جیساکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حال و قال سے ظاہر ہے جو وفاتِ نبویؐ کے وقت پیش آیا۔ خود دہلی اور سہارن پور کے نواح میں بھی اس کا غلغلہ رہا۔ اور تو اور مولانا کے حزب دہلوی (دیوبندی کے مرکز) میں بھی اس کا چرچا تھا، اور ان کے ائمہ حزب دہلوی اس کے راوی ہیں۔ مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (متوفی ۱۳۴۱ھ) رقمطراز ہیں :-

---

[1] کتاب التمہید میں ارشاد ہوا ہے۔

. . . لکن بسبب احترام الصدر محمد اسحاق ما کانوا یجاھرون بالدعوۃ فی دھلی واطرافہ (؟)

(ص ۱۵۱ بحوالہ کتاب التمہید)

"اس کے بعد کچھ حضرت سید صاحبؒ کے غیبوبت وظہور کا ذکر ہوا۔ ان سب لوگوں نے اس بے بضاعت سے پوچھا۔ میں نے کہا اس میں تو شک نہیں کہ سید صاحبؒ نے اس قسم کی پیش گوئیاں فرمائی تھیں۔ لیکن وقوع میں اب تک اشتباہ ہے۔ مولوی محمود حسن صاحب نے فرمایا۔ یہی ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا مسلک ہے، پھر انہوں نے نہایت معتبر ذریعے سے یہ قصہ سنایا۔ اور سب حاضرین نے اس پر اتفاق کیا۔

حدثنا الشیخ الصالح محمود حسن والحافظ احمد بن مولانا محمد قاسم والمولوی حبیب الرحمن وکلھم ثقۃ قالوا حدثنا شیخنا الثقۃ الصدوق الحجۃ مولانا رشید احمد گنگوھی حدثنا الشیخ الزاھد المتقی الاورع الحجۃ مولانا مظفر حسین الکاندھلوی قال سمعت من شیخنا ومولانا السید احمد عشرۃ امور وقعت منھا تسعۃ وبقیت واحدۃ وھو غیبوبتہ وظہورہ رحمۃ اللہ علیہ واللہ علم ......

"یعنی حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی زبانی سنا وہ فرماتے تھے کہ ہم نے مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے سنا، وہ فرماتے تھے۔ کہ ہم نے سید صاحب کی زبان سے دس پیشین گوئیاں سنیں، نو ان میں سے واقع ہو چکی ہیں۔ اور ایک باقی ہے۔ وہ پیشین گوئی آپ کی غیبوبت اور ظہور کے بارے میں ہے ...

. . . . الخ الخ

(ارمغانِ احباب: معارف جلد ۴۳ ص ۲۰)

جب مولانا مظفر حسین کاندھلوی (جو مولانا محمد اسحاق کے شاگرد اور مولانا سندھی کے حزب دہلوی کے ائمہ اوّلین اور دہلی بورڈ کے ارکان اربعہ میں سے ہیں، ص ۱۸۲، ۱۸۳ حاشیہ، ف ۱۲۸۳ھ) جیسے بزرگ روایت غیبوبت کے راوی ہوں، اور اس کا چرچا اہل علم کے دہلوی مرکز میں ہو تو پھر مولانا ولایت علیؒ اور اہل صادق پور پر یہ عتاب خاص کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان سے لغزش ہوئی۔ اور یہ فرطِ محبت کی لغزش تھی، اس خیال کو مرکزی فکر یا عقیدے کی حیثیت کبھی نہیں حاصل ہوئی۔ اور نہ وہ معاذ اللہ اس کے آڑ میں کوئی پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ اللہ کے برگزیدہ بندے

اس سے بہت بلند اور ان کی سیرت ان چھچھوری باتوں سے پاک اور بے داغ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے مولانا اپنی وسعتِ نظر اور جہاں بینی کے باوجود، اہلِ صادق پور کے حالات واقعات سے بہت سرسری واقفیت رکھتے ہیں، جس کا انہیں خود بھی اعتراف ہے۔

"جس تفصیل کے ساتھ ہم دہلوی (دیوبندی) پارٹی کے حالات جانتے ہیں، اس قدر (صادق پور) پٹنہ کی تحریک سے آشنا نہیں، تتمیم مبحث کے لیے ہم دوسری پارٹی کے مجمل حالات بیان کرتے ہیں" (ص ۱۹۰)

اے کاش! کہ یہ مجمل حالات صحیح ہوتے۔

ہمارے مولانا کے ہاں تعارض بھی عجیب و غریب ہے، عقیدۂ غیبوبت کے متعلق ایک جگہ (ص ۱۹۵، اقتباس اُوپر گذر چکا ہے) لکھا ہے کہ اس پارٹی کا مرکزی فکر یہی بتایا ہے، دوسری جگہ جزم کا صیغہ استعمال ہوا ہے:

وکان الاصل السیاسی للصادق پوریین اعتقاد غیبوبة الامیر الشہید، ص۱۹۱	(عقیدۂ غیبوبت کو صادق پوریوں کے اصل (مرکزی فکر) کی حیثیت حاصل تھی)

اور تیسری جگہ "کلمۂ حق" زبان سے نکل جاتا ہے:

"...... مولانا ولایت علی نے ہندوستان کے مشرقی حصہ پر اپنا اثر قائم کر لیا اور افغانی پہاڑوں میں اپنا مستقل مرکز بنایا، ان کی اولاد اب تک اس علاقے میں اپنی امارت اور اپنا مرکز رکھتی ہے، مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک چھوٹے پیمانے پر امیر شہید کی حکومت موقتہ کی یادگار ہے۔ ہمارا اپنا خیال مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق یہ ہے کہ وہ مولانا شہید کی اس خاص جماعت کو زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی لئے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن خان جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں" (ص ۱۹۶)

خط کشیدہ فقروں میں مولانا نے جو کچھ کہا ہے، اس سے زیادہ ہم بھی نہیں کہتے، البتہ اتنی ترمیم[1] کے ساتھ وہ

---

[1] اس ترمیم کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ہمارے مولانا ولایت علی تو محض آمین و رفعیدین (باقی اگلے صفحہ پر ۹۸)

سید شہیدؒ اور مولانا شہیدؒ دونوں کی مشترک خاص جماعت کو زندہ کرنا چاہتے تھے، اور اس میں وہ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے بڑی حد تک کامیاب ہوئے گو جان و مال کی بازی لگا کر نتیجہ کیا ہوا اُسے نہ پوچھیے:

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن ۔۔۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔۔۔ اے رُو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

غیبوبت سے متعلق دو حرف اور

مولانا کو صادق پور کے لٹریچر پر اطلاع نہیں، ورنہ انہی کی تحریروں سے اس کی جھلک[ا] مل جاتی اور نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) اور مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (ف ۱۳۲۹ھ) کی شہادتوں کی ضرورت نہ پڑتی، مگر جب پیش کی جا چکی ہیں، تو ان کی چھان پھٹک ضروری ہے۔

نواب صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"جمعے از عظیم آباد و بنگالہ در بارۂ سید احمد بریلوی مرحوم نیز ایں گمان کردہ اند، تا آنکہ بعض از مریدان ایشاں چہل حدیث دریں باب جمع نمودہ و ایشاں را مہدی وسط قرار دادہ قائل بغیبوبت ایشاں در جبال مغربیہ ہند شدہ منتظر عود بودہ اند و ایں زلّت عظیم است وکیف کہ سید مرحوم ایں دعویٰ نہ کردہ ایما بہ عود نہ نمودہ و اگر می کرد، ہیچ کس تصدیق

ـــ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ والی اہل حدیث جماعت کا رہبر سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کے بعد کے جملے (اور اسی نے الخ) سے مترشح ہوتا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔ مولانا ولایت علی سید صاحبؒ کی جماعتِ مجاہدین کے رہنما تھے، اور ان کے خاندان کا مرکزی فکر صرف جہاد رہا۔ اہل حدیثیت تو ان کے ہاں بہت بعد میں آئی ہے۔ ان میں سے اکثر اپنے کو حنفی مع القول بالترجیح کہتے تھے۔ مولانا عبد الرحیم تک یہی مسلک تھا۔ (دیکھو، تذکرہ صادقہ (ص ۱۱۹-۱۱۷)

[ا] عقیدۂ غیبوبت کو اہل صادق پور کے ہاں کوئی ایسی اہمیت نہیں تھی کہ اس کی تبلیغ کی جاتی۔ ایک خیال تھا، جس سے کچھ دنوں تک بعض حضرات متاثر رہے۔ ان کے بعض رسالوں میں اس "تاثر" کا دھندلا سا نشان ملتا ہے۔

نہ می نمود" (ص ۱۹۳ حاشیہ)

اربعین فی المہدیین

نواب صاحب (جنہیں مولانا سندھی، مولانا ولایت علی کا ہم مسلک بھی بتاتے ہیں، ص ۱۹۶) کے اس بیان میں ایک بات تو بالکل بے بنیاد ہے۔ الاربعین فی المہدیین جس کا او کنلے وغیرہ نے بھی ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے ہے[1]۔ ہم نے اسے بار بار شروع سے آخر تک دیکھا کہ شاید کہیں سید صاحب کا نام آگیا ہو، یا ان کی مہدویت کی تبلیغ کی گئی ہو، لیکن اس میں ایک حرف بھی ایسا نہ ملا جس سے نواب صاحب اور دوسروں کے عائد کردہ الزام کی تائید ہوتی ہو۔ یہ "چہل حدیث" کا ایک مجموعہ ہے، جس میں صرف خروجِ مہدی سے متعلق حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کے مرتب خود مولانا ولایت علیؒ صاحب ہیں، اور انہوں نے حدیثوں کے جمع کرنے کے سوا اپنی طرف سے ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ شروع شروع بڑی حیرت ہوتی ہے، کہ نواب صاحب جیسے عالم کو ایسی جرأت کیونکر ہوئی، لیکن جو لوگ ان کی زندگی کی الجھنوں سے واقف ہیں، وہ انہیں معذور رکھیں گے، دیکھیے تو کس انداز سے "جمعے از عظیم آباد و بنگالہ" کہتے ہیں، گویا مولانا اولاد حسین قنوجی (ف ۱۲۵۳ھ) خلیفہ حضرت سید شہیدؒ، کے فرزند دلبند کو اس کی بھی خبر نہیں تھی کہ روایتِ شہادت میں اختلاف کیونکر پیدا ہوا۔؟ اور اس میں خود سید صاحب کے گھر والوں[2] اور اہلِ قافلہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ اور پھر چہل حدیث کے

---

[1] ہمیں بڑی تلاش ہے مولانا ولایت علیؒ کے نو رسالوں کا ایک مجموعہ (مجموعہ رسائل تسعہ) دیکھنے کے لئے ملا، اسی میں تیسرا رسالہ اربعین فی المہدیین ہے، ایک کالم میں اصل رسالہ ہے اور برابر کے کالم میں مولانا الٰہی بخش صاحب بڑاکری بہاری ف ۱۳۴۴ھ ہجری کے قلم سے اردو ترجمہ ہے۔ مطبع فاروقی دہلی میں چھپا تھا (تاریخ طباعت درج نہیں)

[2] مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں:-

سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ جن سے قبل از معرکہ بالاکوٹ سید صاحبؒ نے اپنی غیبوبت کی پیشین گوئی کی تھی و سید صاحبؒ اکثر اقرباء و اہلِ قافلہ آپ کی غیبوبت کے قائل تھے مگر نجابے ہندوستان کے اکثر آدمی پتہ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں (سوانح احمدی: ص ۱۳۷، نیز ملاحظہ ہو: سیرت سید احمد شہید ص ۲۳۳-۲۳۰)

انتساب میں بعض از مریدان الیشان کرچپ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مولانا ولایت علی مرحوم کی گود میں وہ کھیل چکے ہیں، اور انہی کی ترغیب سے نواب صاحب نے بلوغ المرام کی طرف توجہ کی اور شرح میں لکھیں، (تذکرہ صادقہ، ص ۱۲۱، وسیرت والاجاہی جلد ۲ ص ۱۹۲ بحوالہ ابقاء المنن روض الخضیب ص ۱۹۲)

اصل یہ ہے کہ وہ حکومت کے سامنے اپنے کو عظیم آباد اور صادق پور سے بالکل بے تعلق دکھانا چاہتے تھے اور یہی ہو کر رہا، اب رہ گئی، مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی کی تحریر، جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:-

زعما کثر العوام وبعض الخواص	(اکثر عوام اور بعض خواص امام
فی حق الغازی الشهید الامام	امجد، غازی شہید حضرت سید احمد
الامجد السید احمد البریلوی	بریلوی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ
رضی الله عنه انه المهدی المحمود	خیال کرتے ہیں کہ وہ مہدی موعود
(؟ الموعود) وانه لم یستشهد	ہیں۔ اور وہ میدان جنگ میں شہید
فی معرکة الغزو بل انه اختفی	نہیں ہوئے بلکہ لوگوں کی نگاہوں
عن اعین الناس وهو حیٌّ موجود	سے چھپ گئے ہیں اور وہ اب
فی العالم ۔۔۔۔ (ص ۹-۱۹۸)	تک زندہ ہیں) ۔۔۔۔۔۔۔۔

"بعض الخواص" پر مولانا سندھی نے یہ حاشیہ دیا ہے:-

قلت مراده من بعض الخواص	(بعض خواص سے مشہور عالم امیر
الشیخ الجلیل الامیر ولایت علی	ولایت علی ممدوح مراد ہیں، جنہوں

لے نواب صاحب کا حال کچھ فرقہ ملامتیہ کا سا ہے، اہل نجد کی بھی کوئی برائی نہیں ہے، جو انہوں نے اپنی کتابوں میں نہ کی ہو، (اتحاف النبلاء ص ۱۳۱۹، التاج المکلل، موائد العوائد وغیرہ) اور یہ صرف وہابیت سے برأت کے لیے، ورنہ وہ دل سے نجد کی دعوتِ توحید کے معترف اور ثناخوان ہیں، (اتحاف، ص ۴۸) کچھ یہی حال ان کا اہل صادق پور کے ساتھ ہے، ایک مرتبہ کلکتہ سے واپسی میں ملنے کی خواہش ہوئی تو دانا پور میں غلس کے وقت علمائے صادق پور کو آنے کی تاکید کی، کہ کراماً کاتبین کو خبر نہ ہو ملاقات ہوئی باتیں ہوئیں مگر اس حال میں کہ ہر آن رقیبوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا،

(بہ روایت مولانا عبد الغفار صادق پوری)

المذکور دعا الی ھذہ العقیدۃ   نے اس عقیدے کی سرگرمی کے ساتھ

دعوۃ حثیثۃ (حاشیہ ص۱۹۸)   تبلیغ کی،

یہ مولانا کی زبردستی ہے، مولانا ولایت علی نے کبھی اس عقیدہ کی تبلیغ نہیں کی، سرگرمی کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ ان کی دعوت صرف جہاد اور احیائے سنت کی تھی، مزید براں قرینے ایسے ہیں کہ مولینا شمس الحق (ف ۱۳۲۹ھ) کا اشارہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کی طرف ہو ہی نہیں سکتا، ہمارے شمس المحدثین کی پیدائش ۱۲۷۳ھ میں ہوئی، ان کا خاندان صادق پور سے کبھی کسی طرح وابستہ نہیں رہا، خود ان کی تعلیم و تربیت صادق پوری اثرات سے بہت الگ ہوئی، وہ مولانا بشیر الدین قنوجی (ف ۱۲۹۶ھ)[1] اور میاں صاحب سید نذیر حسین محدث (ف ۱۳۲۰ھ) کے شاگرد اور ہم مشرب تھے، غیبوبت کا عقیدہ یا خیال اگر کہیں تھا بھی، تو اندر اندر، اور شمس المحدثین کے شباب تک تو وہ اندھی عقیدت ختم ہو چکی تھی، اور رہ گئی تھی تو بالکل برائے نام اور ایک محدود دائرے کے اندر، ان حالات میں ان کے لئے مولانا ولایت علیؒ (جو ان کی ولادت سے چار برس پہلے جان، جان آفرین کو سپرد کر چکے تھے) کے خیالات کا پتہ لگانا بہت دشوار تھا، اس کے علاوہ ہمارے پاس ایسی زبانی شہادتیں ہیں[2] جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عون المعبود کی مندرجہ بالا عبارت میں مولانا کا اشارہ اپنے ایک عظیم آبادی معاصر[3] کی طرف تھا، جو ایک جید حنفی عالم تھے، اور شمس المحدثین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے،

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند (ص ۳۲۹) میں مولانا بشیر الدین قنوجی کا سالِ وفات ۱۲۷۳ھ بتایا گیا ہے، جو صحیح نہیں مولانا شمس الحق (مولود ۱۲۷۳ھ) ان کے شاگرد ہیں، نیز وہ نواب صدیق حسن خان صاحب کے دور میں بھوپال کے قاضی رہے ہیں،

[2] ابھی مولانا شمس الحق مرحوم کے دیکھنے اور سننے والے بیسیوں اہل علم موجود ہیں جن میں سے بعض ممتاز حضرات کی خدمت میں اس خاکسار کو نیاز حاصل ہے، اور ان میں سے اکثر سے راقم نے اس موضوع پر گفتگو کی، اور ہر ایک نے اس بات کی تائید کی کہ شمس المحدثین کا اشارہ مولانا ولایت علی کی طرف نہیں ہو سکتا،

[3] غالباً ان کا نام مولوی محمد عظیم تھا، ہمیں جن بزرگ کے واسطے سے یہ روایت پہنچی، انہوں نے نام بتانے سے انکار کیا،

مولانا عنایت علی غازی کے ابتلاء و محن اور ان کی جماعت کی ابتری کو بھی مولانا سندھی عقیدۂ غیبوبت کا شاخسانہ بتاتے ہیں جس کی وجہ صرف لاعلمی ہے۔

ثم قام مقامہ الامیر عنایت علی لکن ما حصل الاتفاق علی الجہاد والقتال بل جلسوا منتظرین فتوفی سنۃ ۱۲۷۳ھ (؟ ۱۲۷۴) (ص ۱۹۱)

(پھر ان کی جگہ مولانا عنایت علی نے لی، لیکن جہاد و قتال پر اتفاق نہ ہو سکا، بلکہ لوگ منتظر بیٹھے رہے۔ (یعنی سید صاحب کی واپسی کے) ان کا انتقال ۱۲۷۴ھ (؟) میں ہوا)

لکن حدث فی اصحاب الامیر عنایت علی جمع من المجاہدین ما وافقوھم علی ھذا الاصل بل مالوا الی الدھلویین (ص ۱۹۱)

(لیکن مولانا عنایت علی کی جماعت میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو اس عقیدے میں ان کے ساتھ متفق نہ رہ سکے، بلکہ ان کا رجحان دہلویوں کی طرف ہو گیا)

جس المناک واقعے کو مولانا نے عقیدۂ غیبوبت کا شاخسانہ بتایا ہے، اس کی اصلیت بھی معلوم کر لیجئے؛

"جب مولانا ولایت علی کا بماہ محرم (۱۲۶۹ھ) موضع ستھانہ ملک سوات میں انتقال ہو گیا، تو آپ (یعنی مولانا عنایت علی) منگل تھانہ سے وہاں واپس آئے، اور باتفاق تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی، اور جب تک سید اکبر شاہ کی اولاد (سید مبارک، سید عمر، سید عمران سید مدار) نے فقراء مجاہدین کے ساتھ بے وفائی نہیں برتی وہیں قیام فرمایا، پھر بہ حالت مجبوری مع مجاہدین منگل تھانہ واپس آکر مسکن گزین ہوئے اور باقی زندگی قلیل مجاہدین کے ساتھ وہیں ختم کر دی"۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پُرخطر تھی، شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا، املاک تہلکہ میں تھے۔۔۔ ۔۔۔۔ پھر کس کو ہوش تھا اور کیونکر ممکن تھا، کہ سرحد پار فاقہ کشوں کے لیے کوئی سامان کیا جا سکتا تھا[1] مسلسل

---

[1] یہ وہ لکھ رہا ہے، جو سرحد پار مجاہدین کے لیے روپیہ اور سامان فراہم کرنے والوں کا سرگرم شریک و معاون تھا یعنی مولانا عبدالرحیم صادق پوری برادر زادہ مولانا ولایت علی و مولانا عنایت علی متہم مقدمۂ سازش انبالہ و اسیر پورٹ بلیر)

فاقہ کشی نے حالت تباہ کردی، درختوں کی کونپلوں اور پتیوں پر اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی، اجابتیں خون آلود ہونے لگیں، آپ کے پاس جو نقود تھے، آپ مہاجرین وانصار پر صرف کر چکے تھے، اور وہ تھا ہی کیا، اونٹ کے منہ میں زیرہ! اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے، زندگی تلخ تھی، یہ وقت تھا کہ اگلی امم مضطر ہو کر متی نصر اللہ پکار اٹھی تھی، مگر اس صبر واستقامت کے کوہ نے نہایت حلم و رضامندی کے ساتھ اللھم بالرفیق الاعلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضہ بخار وضیق النفس ۱۲۷۴ھ کے آخر میں (مطابق ۱۸۵۸ء) اجن المومنین سے جنت نعیم کو رحلت کی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ واحشرہ فی زمرۃ المہاجرین الذین ھاجروا وجاھدوا مع نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

(تذکرہ صادقہ ص ۱۳۷-۸)

ان روح فرسا حالات میں اگر مجاہدین انگریزی علاقہ پر کوئی حملہ نہ کر سکے، یا خود ان کی جماعت میں کچھ اختلال پیدا ہو گیا، اور امیر کی اطاعت سے کچھ لوگ منحرف ہو گئے، تو اسے غلط معنی کیوں پہنائے جائیں؟

۳۔ امام شوکانیؒ سے سند واجازتِ حدیث

انشقاق جماعت اور مسئلہ غیبوبت" کے علاوہ مولانا ولایت علی کا ایک بڑا جرم یہ بھی ہے کہ انہوں نے نجد و یمن کی سیاحت کی، اور امام محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) سے روایت حدیث کی سند واجازت لی (ص ۱۳۲، ۱۹۱) ہم پہلے بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ بیرونِ ہند کے اہل علم سے استفادہ کرنا کوئی جرم نہیں۔ اسلام اس قسم کی جغرافیائی حد بندیوں کا قائل نہیں۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (ف ۱۱۷۶ھ) نے مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر کردی مدنی (ف ۱۱۴۵ھ) سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) نے سفر حج کے موقع پر امام شوکانیؒ سے خط وکتابت کی اور ان کی تصنیفات حاصل کیں (سیرت احمد شہید، ص ۳۲۰) اور مولانا کی روایت کے مطابق (ص ۱۰۴ حاشیہ) مولانا شہید نے بھی نجدیوں کے پاس اپنا نامہ بر بھیجا تو پھر مولانا ولایت علی ہی کیوں گنہگار قرار دیئے جائیں۔

رفض وتشیّع کا الزام

ایک ضروری بات رہ گئی جسے آخر میں عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ مولانا نے ایک جگہ فخریہ لکھا

ہے کہ ان کی دہلوی یا دیوبندی پارٹی اپنے نجدی ویسی مخالفوں کو چھوٹا رافضی کہہ کر پکارتی تھی، پتہ نہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے؟ ہمیں اُمید نہیں کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی (ف ۱۲۹۶ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (ف ۱۳۲۳ھ) جیسے متورع عالم اپنے اہلِ حدیث اور غیر حنفی معاصروں پر ایسے الزام دھرتے ہوں گے۔ کم از کم راقم کی طبیعت اسے قبول نہیں کرتی، بہر حال حزب دہلوی (دیوبندی) کے ترجمان مولانا سندھی رقم طراز ہیں:۔

"مدرسہ دیوبند پہلی درس گاہ ہے، جس نے مدرسہ دہلی کے بعد اس اصول پر کام شروع کیا دیوبندی نظام نے پچاس سال میں جس طرح کامیابی حاصل کی ہے، وہ اس تجدید کی صداقت کے لیے شاہد عدل ہے:۔

اس نظام کو پختہ بنانے کے لیے عوام کو بتلایا گیا کہ جس قدر رہنما فقہ حنفی اور ہندوستانی تصوف چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ حقیقت میں شیعہ پارٹی کا کام کرتے ہیں، اس زمانے میں حزب ولی اللہ کا متوسط طبقہ ہر ایسے انسان کو جو فقہ اور تصوف کا انکار کرتا "چھوٹا رافضی" کہتا رہا ہے۔"

(ص ۱۸۰، ۱۷۸)

ہم نہیں جانتے کہ موجودہ دیوبندی نظام سے تعلق رکھنے والوں میں کتنے افراد مولانا کے اس بیان سے اتفاق کر سکیں گے؟ بہر حال اتنا ہم جانتے ہیں، کہ ان کی بڑی تعداد

ع سعدی از دست خویشتن فریاد

پکار اُٹھے گی۔

اس پر ایک مختصر سا حاشیہ بھی ہے، جس میں حضرت سید شہیدؒ کو بھی اس گندگی میں شریک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"چھوٹا رافضی" شاہ اسحاقؒ کے متبعین جب کو اس قسم کا پاتے، عوام سے کہتے کہ یہ چھوٹا رافضی ہے۔ یہ جملہ دراصل امیر شہیدؒ کا بنایا ہوا ہے۔ مگر کثرت سے استعمال اس کا شاہ اسحاق کے متبعین نے کیا۔"

ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرت سید شہیدؒ پر ایک صریح بہتان ہے۔ سید صاحب اور ان کے مخصوص اصحاب کا کیرکٹر بہت بلند رہا ہے، اور "کفِ لسان" تو ان کی خاص خصوصیت رہی ہے۔

عما کان علیہ الصدر الشهید	" دونوں جماعتوں (حزب دہلوی اور
حدث الاختلاف الکثیر بین	حزب صادق پوری) کے علوم اور معارف
(؟) العلوم والمعارف بین الحزبین	میں بڑا اختلاف رونما ہو گیا)

... (ص ۱۳۳)

ظاہر یہ، مُحدّثین، حنابلہ نجد، گو تین لقب ہیں، مگر ان تینوں کے مصداق غالباً نجد کے حنبلی ہی ہیں، اس لیے ہم پہلے یمن کے زیدیوں سے شروع کرتے ہیں، اس تحریر کے پڑھنے والوں کو غالباً اَب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ "بعض ائمۃ الصادقپوریین" کا اشارہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کی طرف ہے، ان کا قصور یہ ہے کہ یہ سفر حج (۱۲۴۰-۹ھ) کے سلسلہ میں یمن ہوتے ہوئے قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) سے سند واجازتِ حدیث لے آئے تھے، جسے مولانا عبید اللہ معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ ہمارے مولانا کے نزدیک امام شوکانی قطعی طور پر زیدی ہیں۔

امام شوکانی اور زیدیت

صاحبِ نیل الاوطار کے علم وکلام کا انہیں پُورا اعتراف ہے، لیکن تقلید کی جکڑ بندیوں سے آزادی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، بہر کیف شوکانی کے متعلق مولانا کی رائے سُننے کے لائق ہے۔

... واشتغلت بالاستفادة من	(اور میں ان کی کتابوں سے ایک عرصہ
کتبه مدة طویلة وانّی	تک استفادہ کرتا رہا۔ اور مجھے اس کا
معترف بانّ الله اعاننی بتلك	اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کے
التصانیف علی فهم طریقة	ذریعہ مجھے محقّقین کے طریقے کے سمجھنے
المحقّقین لکن ما وافقت	کا سلیقہ عطا کیا، لیکن بہترے اجتہادی
الشوکانی فی کثیر من	مسئلوں میں ان کی مخصوص رائے سے
مجتهداته والّذی اعتقد فی	اتفاق نہ کر سکا، اور ان کے متعلق
حقه انّه عالم منصف مجتهد	میری رائے یہ ہے کہ وہ ایک
فی الاصول والفروع، زیدی	انصاف پسند عالم، اصول وفروع میں

ینصر السنۃ، لکن لا یوافق اہل السنۃ الفقہاء ولا اہل الظاہر منہم فی جمیع ما یقررونہ (ص ۱۳۹)

مجتہدانہ نظر و فکر رکھتے ہیں، وہ زیدی ہیں اور سُنّت کے حامی، لیکن تمام باتوں میں نہ تو وہ اہل سُنّت فقیہوں کے ہم نوا ہیں نہ ظاہریوں کے)

زیدیت کے سوا، راقم کو اس چارج شیٹ کے حرف حرف سے اتفاق ہے، واقعی وہ محقق ہیں، اور اصول و فروع میں مجتہد بھی، القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید اور ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول اس پر گواہ ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ فقہ میں فقہا اور ظاہریوں دونوں سے متعدد مسئلوں میں الگ رائیں بھی رکھتے ہیں، الدرر البہیہ اور اس کی شرح الدراری المضیئہ اس کی آئینہ دار ہیں، پر اس کے باوجود وہ زیدی نہیں تحقیقی مسلک اور مجتہدانہ نظر و فکر سے زیدیت تو لازم نہیں آتی، اور یہ ایسی روشن حقیقت ہے، جسے ہر طالب علم جانتا ہے، لیکن جب ایک جہاں دیدہ عالم انہیں زیدی کہتا ہے، اور اس کی بنیاد پر قیاس و تخمین کے ہوائی قلعے بھی تیار کرتا ہے، . . . .

لہ مولانا، پہلے شوکانی کو زیدی کہتے ہیں، اس کے بعد ان کے ایک شاگرد (عبدالحق بنارسی) کو زیدی شیعہ کہتے ہیں، اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سید شہید کی غیبوبت کے مسئلے میں یہ شیعہ (عبدالحق بنارسی) اور شوکانی کا ایک دوسرا شاگرد (ولایت علی) پیش پیش تھے، گویا کنایہ یہ چاہتے ہیں (گو صاف صاف نہیں کہتے) کہ سید صاحب کی غیبوبت کا خیال شیعوں سے مستعار لیا گیا ہے، کہاں کی بات کہاں پہنچا دی؟ یہ ہوائی قلعے نہیں تو اور کیا ہیں؟

لیکن بدقسمتی سے اس کی پہلی اینٹ ہی غلط رکھی گئی یعنی شوکانی پر زیدیت کا الزام اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے مان بھی لیا جائے (جیسا کہ ہم نے کہیں اشارہ بھی کیا ہے) تو زیدیت سے غیبوبت کا عقیدہ کس طرح مستعار لیا گیا؟ زیدیت اور اثنا عشریت میں بڑا فرق ہے، امام غائب کا عقیدہ اثنا عشریوں کا جزو ایمان ہے، زیدی اس کے قائل نہیں یہ زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم ش ۱۲۲ھ) کے پیرو ہیں، زیدیت کے متعلق تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (۱) توضیح المسائل العقلیۃ از عماد الدین یحییٰ بن محمد بن حسن بن مسعود المقرائی الزیدی (من رجال القرن العاشر للھجرۃ) ورق ۲۴-۲۷-۳۰ الخ (۱۱) الملل والنحل (شہرستانی) ا ص ۱۲۱ و ص ۱۵ لندن (۱۱۱) تحفہ اثنا عشریہ (شاہ عبدالعزیز صاحب) ص ۸، نیز دیگر مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے حوالے کے لیے ملاحظہ ہو، فہرست مشروح انگریزی، مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ جلد ۱۰ نمبر ۶۲۶، اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مضمون الزیدیۃ (ص ۱۱۹۶۰)

توپھر جانی بوجھی ہوئی چیز کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ضروری ہوجاتا ہے، خاکسار کی یہ کوشش ہوگی کہ مختصر سے مختصر طور پر اپنی گذارشیں پیش کردے۔

(۱) مولانا کے اندازِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں زیدی ہی زیدی ہیں، اور وہاں کسی متبعِ سُنّت عالم کا وجود وہ مستبعد خیال کرتے ہیں، لیکن یہ واقعہ اور حقیقت کے خلاف ہے یمن میں محقق اہلسنت علماء کا گروہ ہمیشہ اور ہر دور میں رہا ہے، ان کی تصنیفیں "یمنی ایمان" اور "یمنی حکمت" کے نمونوں سے بھری پڑی ہیں۔

یمن کے چند فحول علمائے اہل سُنّت

(الف) السیّد محمد بن ابراھیم بن عبداللہ عزالدین المرتضی ابن الھادی ابن الوزیر صاحب العواصم والقواصم فی الذب عن سنۃ ابی القاسم (ف ۸۴۰ھ) ان محقق علمائے سُنّت کے سرخیل ہیں، علامہ ابن الوزیر کے تسنن میں تو شاید ہمارے مولانا کو بھی کلام نہ ہو، انہوں نے اپنی تصنیفات میں زیدیت سے صاف صاف براءت کی ہے، البتہ یہ دوسرے فقہی مذاہب کی تقلید سے بھی آزاد ہیں جسے شاید مولانا عبید اللہ پسند نہ کریں، یہ موقع طول کا نہیں تفصیلی حالات و افکار کے لیے ملاحظہ ہو۔ المعجم لابن فہد المکی (ف ۸۸۵ھ) ورق ۱۷۶، الف مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ نمبر ۲۹۴۴، الضوء اللامع، جلد ۶ ص ۲۷۲، اتحاف النبلاء، ص ۴-۳۷۳، بروکلمن ۲ ۱۸۸، ذیل ۲، ۲۴۹ (نیز البدر الطالع ۲ ۹۳-۸۱)

(ب) امام محمد بن اسماعیل الامیر الکحلانی الصنعانی (ف ۱۱۸۲ھ) صاحب سبل السلام شرح بلوغ المرام، زیدیت کی تردید میں ان کی ایک مستقل کتاب جواب اہل السنۃ فی نقض کلام الشیعۃ والزیدیۃ (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ نمبر ۱۰۵)

---

[1] ابن فہد (ف ۸۸۵ھ) کی معجم چونکہ قلمی اور کمیاب ہے اس لیے علامہ ابن الوزیر کے متعلق ان کا بیان نقل کردینا بہتر ہوگا،

وینتمی الی مذھب اھل الحدیث کعادۃ الحنابلۃ شدید المیل الی السنۃ ویتظاھر بمذھب اھل السنۃ بخلاف اھل بیتہ ویجتھد فی اقوال الائمۃ ویختار ما رجح عندہ دلیلہ..... والف مولفات مفیدۃ تو ذن بکثرۃ فضلہ..... واکثر من الرد علی الزیدیۃ الذین نعموا انہ اتباع مذھب اھل السنۃ المعجم لابن فہد المکی ورق ۱۷۶ الف)

موجود ہے، جسے پڑھ کر ان کے اتباعِ سنت کا جذبہ معلوم کیا جا سکتا ہے، اور یوں ان کے عقائد و افکار کا سرسری اندازہ لگانے کے لیے ان کے مختصر رسالے، تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد کا مطالعہ کافی ہوگا، جس کا لہجہ تقویۃ الایمان سے بھی زیادہ سخت ہے، البتہ تقلید کے یہ بھی دشمن ہیں، اور سخت، حرم میں چار مصلوں کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں،

"..... ما احدث فيه (الحرم) بعض ملوك الشراكسة الجهلة الضلال هذه المقامات الاربعة التى فرقت لعبادات العباد واشتملت على ما لا يحصيه الا الله من الفساد ..... (تطهير الاعتقاد مطبع المنار ۱۳۴۳ھ)

..... یہ جو بعض جاہل گمراہ کن چرکسی فرمانرواؤں نے حرم میں عبادت کے لیے چار مقامات الگ الگ کر دیئے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفریق میں (جو گویا بندوں کی پرستش کے لیے ہوئی ہے) فساد کے کتنے جراثیم چھپے ہوئے ہیں"

تردیدِ زیدیّت میں امام شوکانیؒ کی مستقل کتابیں اور اُن کے عقائد

(۳) انہی دونوں بزرگوں کی طرح امام محمد بن علی شوکانی (المولود ۱۱۷۳ھ، المتوفی ۱۲۵۰ھ) بھی محقق سلفی عالم ہیں، علامہ ابن الوزیر اور امام محمد بن اسماعیل الامیر کی طرح انہوں نے بھی زیدیت کی جابجا تردید کی ہے، اصول و فروعِ زیدیہ کی تردید میں مستقل رسالے لکھے ہیں، ان کو زیدی کہنا حق و صداقت کا منہ چڑھانا ہے، شواہد ملاحظہ ہوں،

(الف) زیدی عقائد میں معتزلہ سے قریب ہیں، اور اپنے کو اہل العدل والتوحید کہتے ہیں، "اکثر زیدیہ در فروع موافق مذہبِ حنفیہ اند و در اصول مطابق اعتقاد معتزلہ"

(تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۷ وغیرہ)

امام شوکانی عقائد میں ٹھیٹھ سلفی ہیں، ان کا مختصر رسالہ التحف فی مذاہب السلف اس پر سند ہے،

(ب) زیدی فروع میں ایک خاص مسلک رکھتے ہیں، اور حنفیہ سے قریب ہیں، امام نے ان کے مخصوص مسائل کی تردید میں متعدد رسالے لکھے ہیں،

(۱) السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازہار، میں زیدیہ کی سب سے زیادہ مقبول کتاب الازہار فی فقہ الائمۃ الاطہار کا کھرا کھوٹا الگ الگ کر دکھایا ہے، الازہار امام احمد بن یحییٰ ابن مرتضیٰ محمد بن مرتضیٰ بن

مفضل (ف ۸۴۰ھ) کی تصنیف ہے، اور فقہ میں اہل یمن کا مرجع و ماویٰ ہے، علمائے یمن نے اس کی بیسیوں شرحیں لکھی ہیں، خود مصنف نے الغیث المدرار کے نام سے چار جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے (تاریخ الیمن لعبد الواسع الیمنی، ص ۲۴، بروکلمن ۲، ۱۸۷، ذیل ۲، ۵، ۲۴۴-۲۴۲) اسی الازہار کی تنقید کی وجہ سے صنعاء میں شوکانی کے حامیوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان سخت ہنگامہ برپا ہوا،

"...... و ثارت من اجل ذلك فتنة فی صنعاء الیمن بین من هو مقلد و بین من هو مقتد بالدلیل توهما من المقلدین انه ما اراد الاهدم مذهب اهل البیت لان الازهار هو عمدتهم فی هذه الاعصار ......"

(حسین بن محسن[1] السبعی نیل الاوطار. ج ۱ ص ۱۰)

اور اسی وجہ سے صنعاء (یمن) میں مقلدوں اور دلیل و حجت پر عمل کرنے والوں کے درمیان بڑا ہنگامہ ہوا، مقلد یہ سمجھے کہ یہ (شوکانی) اہل بیت کا مذہب ختم کرنا چاہتے ہیں، چونکہ پچھلی صدیوں میں الازہار ہی پر ان کا تکیہ رہا ہے،

. . . .

نواب صدیق حسن خان صاحب نے بھی غالباً اسی فتنے کی طرف اشارہ کیا ہے، "زیدیہ بسبب رو بر مذہب ایشان تعصب تمام بر د. بارہا بصورت بلوی بر آمدہ خانہ، او را محاصرہ کردند، چون وے یکبار از خانہ بر آمد ہمہ بگریختند، الخ."

(اتحاف النبلاء ص ۴۰۹)

(۱۱) الصوارم الهندیه المسلولة علی الریاض الندیه،

زیدیہ وضوء سے پہلے غسل فرجین کے قائل ہیں، اور یہ ان کے نزدیک وضوء کے ارکان میں داخل ہے، اسی کی تردید میں یہ رسالہ ہے۔

(۱۲) تشنیف السمع بابطال ادلة الجمع زیدیہ حضر میں بھی جمع صلاتین کے جواز کے قائل ہیں، قاضی

---

[1] نیل الاوطار جلد اول (مطبوعہ مصر ۱۲۹۷ھ) کے آغاز میں (ص ۱۴-۱۹) حسین بن محسن السبعی الانصاری (ف ۱۳۲۷ھ) کے قلم سے مصنف نیل کا ترجمہ درج ہے مگر انہوں نے عبد الرحمٰن بن احمد البہکلی تلمیذ شوکانی کی کتاب نفح العود فی ایام الشریف حمود سے نقل کیا ہے،

شوکانی نے تشنیف السمع میں اس کی تردید کی ہے، زیدیہ کی تردید میں ان کے اور بھی رسالے ہیں جن کا استقصاء یہاں مشکل ہے۔

(ج) الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید[1] امام شوکانی کا ایک چھوٹا سا توحید ی رسالہ ہے جس کے مضامین تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید سے ملتے جلتے ہیں، اور تشدد کا بھی وہی انداز ہے، جزئی اختلافات کا تذکرہ آگے آئے گا، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) کی طرح[1] انہوں نے بھی اس رسالے میں قصیدہ بردہ کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے۔

یَا اَکْرَمَ الْخَلْقِ مَالِیْ مَنْ اَلُوْذُ بِہٖ — سواک عند حلول الحادث العمم

(اے مخلوقات میں سب سے زیادہ بزرگ مصیبتوں کے عالم میں آپ کے سوا میرا کون ہے جس کے دامن کی پناہ لے سکوں)

(د) شوکانی حدیث کے باب میں خالص اہل سنت کا مسلک رکھتے ہیں، اور صحیحین کو وہی درجہ دیتے ہیں جس کی یہ مستحق ہیں، تحفۃ الذاکرین[2] کے تمہیدی مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"..... واعلم ان من کان من	واضح رہے کہ اس کتاب کی جو حدیثیں
احادیث ھذا الکتاب فی الصحیحین	صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) میں ہیں
فقد اسفر صبح الصحۃ لکل ذی	تو ان کی صحت روز روشن کی طرح
عینین لانہ قد قطع فیھا عرق	آشکارا ہو چکی ہے، اس لیے کہ ان کی
النزاع ما صح من الاجماع علی تلقی	قبولیت پر تمام اسلامی جماعتوں کا
جمیع الطوائف الاسلامیۃ	اجماع ہو چکا ہے، جس نے ان کے
لما فیھا بالقبول وھذہ رتبۃ	باب میں کسی اختلاف کی گنجائش ہی
فوق رتبۃ التصحیح عند جمیع	نہیں باقی رکھی ہے اور تمام اہل معقول
اھل المعقول والمنقول (دیباچہ)	و منقول کے نزدیک یہ تصحیح کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔"

اب ہمیں بتانا چاہیے کہ کوئی زیدی صحیحین کو غیر مشروط طور پر قبول کر سکتا ہے؟ نرم سے نرم

---

[1] کتاب التوحید ص ۴۶ مطبوعہ باہتمام شرف الدین و اولادہ الدر النضید ص ۲۹ مصر ۱۳۴۳ھ

[2] - ابن اثیر جزری (ف ۸۳۳ھ) کی حصن حصین کی شرح شوکانی نے تحفۃ الذاکرین کے نام سے لکھی ہے۔

زیدی بھی حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی افضلیت اور استحقاقِ خلافت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ اور صحیحین کے تسلیم کرنے سے اس عقیدے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔

امام شوکانی اور حجیتِ اجماع

یہاں تک امام شوکانی کی زیدیت پر گفتگو تھی، لیکن مولانا کو اس سلسلہ میں یمن کے اس نامور عالم سے ایک اہم شکایت ہے۔ اچھا ہو کہ آپ انہی کی زبان سے سنئے:

> یمنی تحریک کے ایک بزرگ امام شوکانی محقق محدث ہیں، اور حزب ولی اللہ کے اتباع میں سے بعض فرقے مستقل طور پر اُن کی اتباع کا دم بھرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں، کہ اتباعِ سنت کی تفصیلی دعوت میں امام شوکانی حزب ولی اللہ کا مساہم ہے۔ مگر حقیقت شناس جانتے ہیں، کہ شوکانی زیدی ہیں، اس لیے حنفیہ سے گو بعض مسائل میں اشتراک ضروری ہے۔ پھر بھی وہ حجیتِ اجماع پر صاف رائے نہیں رکھتے۔ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول اور مولانا شہید کا رسالہ اصولِ فقہ ملا کر پڑھئے، تو فرق واضح ہو جائے گا۔[۲]

اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ شوکانی حجیتِ اجماع پر صاف رائے نہیں رکھتے۔ لیکن مولانا اگر اس اعتراض کو یوں ادا کرتے، کہ اجماع کے مسئلے میں شوکانی حنفیہ کے ہم خیال نہیں، تو زیادہ صحیح ہوتا، اور یہ کوئی وجہ شکایت نہیں، جب آپ انہیں مجتہد فی الاصول والفروع مان چکے۔ تو پھر آپ انہیں اپنے خاص مسلک کا پابند کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ اجماع کے باب میں یہ کوئی نیا اختلاف نہیں، اجماع کی تعریف (حد و رسم) ارکان، شرائط، کس

---

[۱] مثال کے طور پر صحیح بخاری میں باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد کے ابواب (ج ۲ ص ۱۹۹) اور اس کے بعد، مطبع شرقیہ، مصر ۱۳۰۴ھ) سے کوئی زیدی (کتنا ہی رواداری کیوں نہ ہو) اتفاق نہیں کر سکتا۔

[۲] مولانا نے دونوں کتابوں سے اقتباسات دے کر اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں رسالہ "اصولِ فقہ" اور "ارشاد الفحول" کے نقطہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے انکار نہیں، لیکن مولانا نے ارشاد الفحول کا صرف وہ ٹکڑا نقل کیا ہے، جہاں شوکانی نے عام اجماع کی حجیت سے انکار کیا ہے (ص ۱۳۹-۱۴۰)

میں سخت سے سخت اختلافات نہیں، حنابلہ اور اہل ظاہر صرف اجماع صحابہ کو مانتے ہیں، خود امام احمد بن حنبل (ف ۲۴۱ھ) سے دو روایتیں ہیں، مشہور روایت تو یہی اجماع صحابہ کی صحت اور حجیت کی ہے، جس پر حنابلہ کا عمل در آمد ہے، دوسری روایت کے مطابق وہ اجماع کا وجود ہی نہیں تسلیم کرتے، (من ادعی الاجماع فھو کاذب) امام شوکانی کا رجحان بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق اجماع (یعنی الاجماع العام فی کل عصر) کی حجیت ان کے نزدیک مسلم نہیں، اور جہاں جہاں انہوں نے حجیت اجماع پر اعتراض کئے ہیں، وہاں یہی اجماع عام فی کل عصر مراد ہے، باقی رہا اجماع صحابہ تو اس کے وہ منکر نہیں۔

(البحث السابع) اجماع الصحابة حجة بلا خلاف ونقل القاضی عبدالوهاب عن قوم من المبتدعة ان اجماعهم لیس بحجة وقد ذهب الی اختصاص حجیة الاجماع باجماع الصحابة داؤد الظاهری وهو ظاهر کلام ابن حبان فی صحیحه وهذا هو المشهور عن الامام احمد بن حنبل ..... وقال ابو حنیفة اذا اجمعت الصحابة علی شئ سلمنا واذا اجمع التابعون زاحمناهم (ارشاد الفحول: ص ۷۷)	ساتویں بحث، صحابہ کا اجماع بالاتفاق حجیت ہے، قاضی عبدالوہاب نے مبتدعین کی ایک جماعت کی یہ رائے نقل کی ہے ان کے نزدیک اجماع صحابہ حجت نہیں، اور داؤد ظاہری اجماع کی حجیت کو اجماعِ صحابہ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں، اور ابن حبان نے صحیح میں جو کچھ لکھا ہے ظاہراً اس کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں، "جب صحابہ کا کسی مسئلے پر اجماع ہوگا، ہم اسے تسلیم کریں گے۔ اور تابعین کے اجماع میں ہم کلام کریں گے۔"

اس اقتباس سے امام شوکانی کا رجحان[1] نمایاں ہے، پھر بھی ہمارے مولانا انہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، اب تک تو حجیت اجماع پر ان کی رائے صاف نہیں تھی، لیکن آگے چل کر وہ انہیں خود بخود حجیتِ اجماع کا منکر قرار دے کر شیعیت (زیدیت نہیں) کی تعریض سے بھی دریغ نہیں کرتے۔"

---

[1] پوری مفصل بحث کے لیے ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول (ص ۸۰-۸۶) مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۷ھ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

"حجیتِ اجماع پر مدار ہے صدیق اکبر کی خلافت کا، مصحف عثمان کے متبوع ہونے کا ہم جدید اصطلاح میں اجماع کے عوض جمیعۃ مرکزیہ کا فیصلہ استعمال کرتے ہیں، آج جس چیز کو جمیعۃ مرکزیہ کا فیصلہ، کہا جاتا ہے، وہی اس زمانہ کا اجماع ہے، اس کی حجیت کے بغیر کبھی کوئی سیاسی تحریک دنیا میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی لہٰذا شیعہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے، مگر اہلِ سُنّت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے ...."

اہلِ انصاف غور کریں کہ "شیعیت" کی تعریض کہاں تک حق بجانب ہے ؟؟ رہا یہ کہ جمیعۃ مرکزیہ کا فیصلہ کہاں تک اجماع کا منشاء پورا کرتا ہے ؟ سرِ دست ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔

—— ۳ ——

"نجدی" اور "یمنی" تحریکوں کا شوشہ

ہمارے مولانا نے نجدی اور یمنی تحریکوں کا بار بار نام لیا ہے یمنی تحریک سے ان کی مراد غالباً امام شوکانی کا مخصوص مسلک ہے جس کے متعلق مختصر طور پر عرض کیا جا چکا ہے ورنہ ہمیں کسی یمنی تحریک کا حال معلوم نہیں جس سے حضرت سید شہید کے ماننے والے متاثر ہوئے ہوں، اور اسے تحریک کہا جا سکے، اور سچ پوچھئے تو مولینا عبید اللہ کی زیر نظر کتاب سے پہلے اس مخصوص انداز میں یمنی تحریک کا نام بھی نہیں سنا گیا تھا۔

البتہ نجدی تحریک مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر بہت مشہور اور بدنام بھی ہے بد قسمتی سی سید صاحب کی دعوتِ تجدید وجہاد کی طرح یہ تحریک (اگر اسے تحریک کہنا صحیح ہو) بھی غیر تو غیر اپنوں میں بھی نہیں سمجھی گئی، اور خوش عقیدہ لوگوں میں اب تک موحدینِ نجد کے متعلق ایسے خیالات پائے جاتے ہیں کہ پڑھ کر اور سن کر حیرت ہوتی ہے افسوس کہ یہ موقع اس تحریک پر بحث و نظر کا نہیں اور راقم اس موضوع پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ لکھ بھی چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو، سیرت محمد بن عبد الوہاب کا پہلا باب) اس لیے یہاں مختصر سے مختصر لفظوں میں اپنا مدّعا پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

نجدی تحریک کی مختصر حقیقت

نجدی تحریک، یا شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ تا ۱۲۰۶ھ) کی دعوت توحید کا محور صرف وہ دو مقدس چیزیں ہیں جنہیں ہم کتاب و سنت کے نام سے یاد کرتے ہیں شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ) کے معاصر ہیں، اور دونوں بزرگوں نے دو چار سال آگے پیچھے مسجد نبوی میں تعلیم حاصل کی ہے دونوں وقت کے ناگفتہ بہ حالات سے متاثر ہوئے، ملاحظہ ہو (الفرقان ولی اللہ نمبر طبع اول، ص ۲۹۰، ۲۹۱) اور ملتی جلتی راہ اختیار کی یعنی دونوں نے دین مبین کو بدعتوں اور توہمات

کی آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کی کتاب وسنت کے چشمۂ صافی کی طرف دعوت دینے میں بھی دونوں شریک وسہیم ہیں، تقلید جامد کے بندھنوں کے توڑنے میں دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصول میں ہندوستان اور نجد کی تحریکیں ایک ہیں اور اسی یکسانی کی بنا پر اپنوں اور غیروں دونوں کو غلط فہمیاں ہوئیں۔ اور سید صاحب کی تحریک تجدید و جہاد کا ڈانڈا نجد کی دعوتِ توحید سے ملا دیا گیا۔ یہ تصنیف یہاں تک بڑھی کہ حج کے موقع پر سید صاحب کے نجدی داعیوں سے ملنے اور متاثر ہونے کا افسانہ زبان زد ہو گیا۔[۱] حالانکہ یہ سب مغربی مورخوں کی اُپج کے سوا اور کچھ نہیں، نجد و ہند کی تجدیدی تحریکیں اپنی اپنی جگہ بڑھیں اور پھلی پھولیں۔ ہندوستان کی دعوتِ توحید یعنی سید شہیدؒ اور مولانا شہیدؒ کی دعوت شیخ الاسلام کی دعوت سے بالکل مُتاثر نہیں (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ الحرکة الوهابية الهندية السياسية) الضیاء جلد ۵، وہابیت۔ ایک دینی وسیاسی تحریک، الہلال پٹنہ اپریل، مئی، جون ۱۹۳۰ء سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۲۲۲-۲۴۲) لیکن اس اصولی اتحاد اور ظاہری مماثلت کے باوجود دونوں تحریکوں میں کچھ اختلاف بھی ہے اور یہ مقامی حالات اور مزاج کے تنوع کے لحاظ سے ہونا ناگزیر تھا۔ مولٰینا عبید اللہ سندھی نے انہی اختلافات پر بہت زور دیا ہے۔ اور

---

[۱] حضرت سید شہید کی دعوتِ تجدید و جہاد کو نجد کی دعوتِ توحید کا شاخسانہ بتانے میں تقریباً تمام مغربی اہل قلم ہم زبان ہیں، اور بہت سے مشرقیوں نے ان کے سُر میں سُر ملانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو دلچسپ حماقتیں جناب مارگولیتھ سے ہوئی ہیں، وہ شاید کسی کے حصے میں نہیں آئیں۔ (ملاحظہ ہو مقالہ، وہابیت۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۴، ص ۱۰۹۰-۱۰۸۶) یہ پورا مضمون جہالت اور تنگ نظری کا مرقع ہے وقت اور موقع تو نہیں کہ اس مقالے کی دلچسپیاں بیان کی جائیں، مگر ایک لطیفہ نقل کیے بغیر نہیں رہا جاتا "سید احمد کے بھتیجے یا بھانجے (NEPHEW) محمد اسماعیل کی ایک کتاب الصراط المستقیم ہندوستان کے وہابیوں کا قرآن بتائی جاتی ہے:-"

(A WORK BY MUHAMMAD ISMAIL, NEPHEW OF SAIYID AHMAD, AT "SIRAT-AL-MUSTAQEEM", IS SAID TO BE THE KURAN OF THE WAHABIS OF INDIA.) P-1090.

مولانا شہید سید صاحب کے بھتیجے صراط مستقیم وہابیوں کا قرآن، کیا کہنے ہیں اس تحقیق اور ریسرچ کے کوئی نئی بات نہیں بیان کی تو پھر ریسرچ کیا۔؟

حق یہ ہے، کہ اس سلسلے میں انہوں نے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں، اس گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا کا ارشاد پورا نقل کر دیا جائے،

نجد و ہند کی تحریکوں میں فرق و اختلاف

"البتہ عرب کی نجدی تحریک سے حزب ولی اللہ بعض امور میں اشتراک رکھتا ہے، اس لیے ظاہر میں دونوں کو یکساں مان سکتے ہیں، عرب میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کے اتباع میں سے شیخ محمد بن عبد الوہاب[1] توحید کی دعوت دینے کے لیے اٹھتے ہیں، حزب ولی اللہ میں بھی توحید کی دعوت اسی طرح موجود ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا احترام بھی دونوں تحریکوں

۱؎ یہاں پر اصل کتاب کے حاشیے میں جناب شارح مولوی نور الحق صاحب علوی نے نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) کی کتاب ابجد العلوم سے شیخ الاسلام ابن عبد الوہاب کا کچھ حال نقل کیا ہے جس میں بجز مذمت کے سوا کچھ نہیں، نواب صاحب (اللہ انہیں معاف کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے) کا حال اس باب میں قابلِ رحم ہے، اہل نجد کے متعلق ان کے بیانات میں اتنا تعارض ہے کہ انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے، ابجد العلوم، التاج المکلل، موائد العوائد میں طرح طرح کی بے اصل باتیں لکھ دی ہیں، وہ اپنی زندگی کی الجھنوں کے باعث اپنے کو نجد، صادق پور، بلکہ ہر وہابی کہلانے والی جماعت سے الگ دکھانا چاہتے تھے، ترجمان وہابیہ ان کے خیالاتِ پریشان کا آئینہ ہے، لیکن جناب شارح کی خدمت میں ہمیں ایک بات عرض کرنا تھی کہ جہاں آپ نے ابجد العلوم سے نواب صاحب کی رائے نقل کی تھی، (جس میں ان ابن عابدین شامی کی خرافات بھی ہیں، جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا مجرم عبد الوہاب نام رکھتا ہے، یا محمد بن عبد الوہاب) وہیں نواب صاحب کا یہ قول بھی نقل کر دیا ہوتا، جس میں انہوں نے شامی کا قول نقل کر کے اس کی تردید بھی کی ہے۔

وازیں جا ضعف تقریر ابن عابدین ظاہر شد درین کہ وی غیر خود را مشرک می دانست و اسلام را منحصر در طریقہ خود می پنداشت و این نیز معلوم شد کہ عقیدہ او ہمہ موافق اہل سنت و جماعت است ہر چہ نسبت او میگویند مختلق و موضوع است و وی بدان راضی نیست و این افترا و کذب ہم در حیات وے بروے کردند و وے از آں تبرا کرد و بر آں انکار نمود الخ (اتحاف النبلاء ص ۴۱۶)

میں مسلم ہے،

امام ولی اللہ نے شیخ ابراہیم کردی مدنی کے کتب خانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے کافی استفادہ کیا ہے، ازالۃ الخفاء میں بعض اساسی مسائل ایسے ہیں جو یقیناً منہاج السنۃ سے لیے گئے ہیں، امام ولی اللہ شیخ ابراہیم کی اتباع میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی یکساں عزت اور عظمت مانتے ہیں،........

ایسا ہی مولانا محمد اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان (میں) جو حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے، شیخ محمد عبدالوہاب (محمد بن عبدالوہاب) کی کتاب التوحید کی طرح بعض مقامات پر ایک ہی سی بات لکھی ہے،

ہندوستان میں جس قدر اہل علم حزب ولی اللہ کے مخالف ہیں، وہ ان اشتراکی مواقع کی بنا پر دونوں تحریکوں کو ایک بنانے کے لیے کافی سے زیادہ کوشش کر چکے ہیں، ایسا ہی مولانا شہید کی تقویۃ الایمان کا التوسل فی الدعا کو جائز قرار دینا، اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہ مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دینا دو اساسی مسئلے ہیں، جو کتاب التوحید کے مناقض ہیں، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے اتباع ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، جو مولانا محمد اسماعیل شہید کے ان دونوں مسئلوں میں تابع ہوں، ایسی حالت میں دونوں تحریکوں کا ایک سمجھنا سرسری سمجھ کا مغالطہ ہے (ص ۱۲۷ ۱۲۹)

دونوں تحریکوں کا مقصد ایک ہی ہے

جیسا کہ راقم پہلے عرض کر چکا ہے، مولانا سندھی کا یہ فرمانا صحیح ہے، کہ نجد و ہند کی تحریکیں ایک نہیں. لیکن چند فروعی اختلافات کی بنا پر ہم دونوں کو ایک دوسرے کا مناقض بھی نہیں سمجھتے، جب توحید کی دعوت دونوں تحریکوں میں موجود ہے، اور کتاب و سنت کی پیروی پر دونوں کا اصرار ہے، تو پھر فروعی اختلافات کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے؟ ہمارے نزدیک امام محمد بن اسماعیل الامیر صنعانی (۱۰۹۹ھ-۱۱۸۲ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ-۱۲۰۶ھ) تینوں بارہویں صدی ہجری میں اسوۂ محمدی کے سچے نمونے تھے، اور اس وقت کی تیرہ و تاریک فضا میں شمع ہدایت کی حیثیت

رکھتے تھے، آپ چاہیں، تو انہیں مجدد بھی کہہ سکتے ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے ماحول میں دین کی تجدید کی، سنتِ محمدی کے صاف اور شفاف چشمے کو شرک و بدعت کی آلائشوں سے پاک کیا، اور یہ انہی نفوسِ قدسیہ کے دم قدم کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کتاب و سنت کا نام لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور اس پر عمل کرنا اپنا شعار بتاتے ہیں،

انہی بزرگوں کی صف میں ان کے خوشہ چین قاضی محمد بن علی شوکانی (۱۱۷۳ھ–۱۲۵۰ھ) حضرت سید احمد بریلوی (۱۲۰۱ھ–۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی (۱۱۹۳ھ–۱۲۴۶ھ) بھی شمار کیے جا سکتے ہیں، ان تمام مصلحینِ اُمت کی جد و جہد کا مرکز ایک تھا، سب کے سب شمعِ رسالت کے پروانے تھے، اور کتاب و سنت کے شیدائی، یہ اور بات ہے، کہ کہیں امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کا رنگ غالب تھا، کہیں ہندوستانی تصوف کے اثرات باقی رہ گئے تھے، اور کہیں طریقہ محمدیہ کی تلقین ہو رہی تھی، کسی پر شوقِ شہادت کا غلبہ تھا، کوئی تقلیدِ جامد کے حق میں شمشیرِ بُراں کی حیثیت رکھتا تھا، اور کسی کی معتدل مزاجی فقہ سے لے کر تصوف تک تطبیق کو پسند کرتی تھی، پر یہ رجحانات کا فرق ہے، اصولی اختلاف نہیں، اور مزاج و مشرب کے اتنے معمولی فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا مناقض نہیں کہا جا سکتا، اور ایک تحریک (یا دعوت) کے عقیدت مند کے لیے دوسرے کے ساتھ وابستگی حرام نہیں قرار دی جا سکتی، ایک ولی اللٰہی شوکانی[1] اور ان کے شاگردوں سے استفادہ کر سکتا ہے، اور نجدی ولی اللٰہیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر سکتا ہے، اور یمنی لیلائے علم کی تلاش میں بادیہ نجد کی ٹھوکریں کھانا گوارا کر سکتا ہے، اور علم و عمل کے اس لین دین میں فائدے کے سوا نقصان کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ہندی نژاد کے لیے یمنی یا نجدی اہل علم کی شاگردی

---

[1] – یہ کوئی خیالی باتیں نہیں، پچھلے تذکروں میں اس لین دین کی بے شمار مثالیں ملیں گی، دو تین نظیریں سرسری طور پر عرض ہیں، عبدالحق بنارسیؒ (ف ۱۲۷۶ھ) نے شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) اور دوسرے علمائے حجاز و یمن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، محمد بن ناصر حجازی نجدی (ف ۱۲۸۳ھ) نے شوکانی سے یمن میں اور شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی (ف ۱۲۶۲ھ) سے حجاز میں تحصیل کی، اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) کے پرپوتے اسحاق بن عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد نجدی حنبلی (ف ۱۳۱۹ھ) نے سید نذیر حسین صاحب محدث سورج گڈھی (دہلوی، ف ۱۳۲۰ھ) اور مولانا محمد بشیر سہسوانی (ف ۱۳۲۶ھ) سے ہندوستان آکر استفادہ کیا......

اس قدر ملعون و مذموم کیوں قرار دی جارہی ہے؟ کیا اسلام اسی تنگ نظری اور جغرافی حد بندی کی تعلیم دیتا ہے؟
رہ گئے چند اختلافی مسئلے تو سمجھ دار لوگوں کے لیے ترجیح کی راہ کھلی ہوئی ہے، آخر کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان آسمانی کتابیں تو ہیں نہیں، جن سے ادنیٰ اختلاف بھی معصیت شمار ہو، اور پھر یہ مختلف فیہ مسئلے ہیں کتنے؟ مولانا عبید اللہ سندھی جیسے نکتہ رس عالم نے بڑی کوشش سے ایسے دو اساسی مسئلے نکالے ہیں، جن میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں،

۱۔ توسُّل فی الدُّعا میں اختلاف

ان میں سے پہلا مسئلہ تو التوسل فی الدعا کا ہے :۔

"التوسل فی الدعا، مثلاً خدائے تعالیٰ سے استدعا کی جائے، بحرمت فلاں یا بحق فلاں کہہ کر تو اس توسل کو ابن عبد الوہاب نہایت شدت سے ممنوع قرار دیتا ہے، مولانا محمد اسماعیل کے ہاں یہ توسل ناجائز نہیں ہے، تقویۃ الایمان میں اس کے جواز کی تصریح کرتے ہیں" (ص ۱۳۶ حاشیہ)

تقویۃ الایمان کی تصریح بھی پیش خدمت ہے :۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو لوگوں میں ایک ختم مشہور ہے، کہ اس میں یوں پڑھتے ہیں، یا شیخ عبد القادر جیلانی شیأ للہ، یعنی اے شیخ عبد القادر جیلانی کچھ دو تم اللہ کے واسطے، یہ لفظ نہ کہنا چاہئے ہاں اگر یوں کہے کہ یا اللہ کچھ دے شیخ عبد القادر کے واسطے تو بجا ہے ....

(ص ۵۶ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۸ء)

مسئلے کی تنقیح

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ قابل لحاظ ہے، کہ توسل فی الدعا، کوئی ایسا اساسی مسئلہ نہیں جس میں مولانا شہیدؒ اور شیخ ابن عبد الوہاب کے اختلاف کو اتنی اہمیت دی جائے دوسری بات یہ کہ مولینا سندھی کا بیان بہت مجمل ہے، اختلاف کی نوعیت واضح کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، توسل فی الدعا

کی یہ نوعیت جسے ہم توسّل بالذوات بھی کہہ سکتے ہیں احیا میں بلا اختلاف جائز ہے، اموات سے توسّل کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے اعمال خیر و مقبولہ سے توسّل کیا جائے، تو جس طرح اپنے اعمال خیر سے توسّل جائز ہے اسی طرح دوسرے احیاء و اموات کے اعمال خیر سے بھی البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلاً ان سے مانگا جائے، تو یہ شرک ہے، اور اس کے عدم جواز پر بھی اتفاق ہے، اور اگر ذواتِ صالحہ (اموات) سے یہ سمجھ کر توسل کیا جائے کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمائے، تو یہ صدیوں سے محققین علماء کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ رہا ہے، (اور توسل فی الدعاء کی یہی وہ صورت ہے، جس میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی رائیں مختلف ہیں) شیخ عزالدین ابن عبدالسلام ف ۶۶۰ھ) توسل بالذوات (اموات کی صورت میں) کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ خاص کرتے ہیں،

لا یجوز التوسّل الی اللہ تعالیٰ الا بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان صح الحدیث فیہ (الدر النضید ص۶)	"اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی سے توسل کرنا جائز نہیں، بشرطیکہ وہ حدیث جو اس پر دلالت کرتی ہے صحیح مان لی جائے۔"

اس کے برخلاف امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اسے بالکل ممنوع قرار دیتے ہیں اور یہی مسلک فقہائے حنفیہ[2] کا

---

[1] و امّا التوسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم والتوجہ بہ فی کلام الصحابۃ والتابعین فیرید ون بہ التوسّل بدعائہ وشفاعتہ ..... والثانی التوسل بدعائہ وشفاعتہ وھذا کان فی حیاتہ ویکون یوم القیامۃ یتوسلون بشفاعتہ (التوسل والوسیلہ لابن تیمیہ ص ۴۴)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک توسّل بالذات کے معنی توسل بالدعا ہی کے ہیں جو احیا میں جائز ہے

[2] ویکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلان او بحق انبیائك ورسلك لانہ لا حق للمخلوق علی الخالق (الہدایۃ، کتاب الکراہیۃ ص۴۷۱ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۴ء) نیز ملاحظہ ہو، جلاء العینین ص ۲۸۱۔	"اور یہ مکروہ ہے کہ کوئی بحق فلاں کہہ کر دعا مانگے۔ یا اللہ تعالیٰ سے اس کے پیغمبروں اور رسولوں کی حرمت اور حق کا واسطہ دلا کر استدعا کرے اس لئے کہ خالق پر مخلوق کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔"

معلوم ہوتا ہے، شیخ محمد بن عبد الوہاب بھی امام ابن تیمیہؒ کے مسلک پر سختی کے ساتھ عامل ہیں، امام شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) تمام انبیاء اور صالحین سے توسّل کو جائز کہتے ہیں، (الدر النضید ص۲۶) تقویۃ الایمان کی عبارت سے مولانا شہید کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے،

جب محققین علمائے سنّت توسّل بالذوات کے مسئلے میں اتنی مختلف رائیں رکھتے ہیں[1]، تو پھر کسی ایک رائے پر اتنا تشدّد کیوں برتا جائے؟ اور اگر مولانا شہید کے کسی عقیدت مند کو فقہائے حنفیہ اور امام ابن تیمیہؒ کی رائے بھلی لگتی ہو، تو صرف اتنی سی بات پر، اسے مولانا شہیدؒ کے حلقۂ ارادت سے کیوں خارج کیا جائے؟

۲۔ مسئلہ شرکِ اصغر اور شرکِ اکبر میں اختلاف

دوسرا مسئلہ حسب ذیل ہے، آیۃ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ کی تفسیر میں ہر دو کا اختلاف ہے، اس آیت کا ظاہری اقتضا یہی ہے، کہ شرک غیر مغفور ہے اور ماورائے شرک دوسرے کبائر قابلِ مغفرت ہیں، یہ اس آیت کا ظاہری تقاضا ہے، اب شرک کے لفظ کا دو درجوں پر اطلاق ہوتا ہے، شرکِ اکبر، شرکِ اصغر، شرکِ اکبر تو یقیناً کفر ہے.......
شرکِ اصغر کو اہلِ علم کبائر میں شمار کرتے ہیں، ابن عبد الوہاب اس کو شرکِ اکبر سے ملاتا ہے، چونکہ نص میں عموم ہے، اس لیے وہ تخصیص کی اجازت نہیں دیتا، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان شرک اصغر میں مبتلا ہے، اس کا اسلام ان کے ہاں مقبول نہیں ہے،
مولانا شہید یہاں حَکم کے طور پر ایک فیصلہ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں، شرکِ اصغر کی بھی جس قدر سزا مقرر ہے۔ وہ مغفور نہیں ہوگی، شرکِ اصغر کبائر میں شامل نہیں، اس کی سزا اس کے مرتکب کو ضروری طور پر بھگتنا پڑے گی، مگر وہ کفر کے برابر نہیں....... (ص ۳۶۱، ۱۳۷ حاشیہ)

---

[1] توسل پر تفصیلی معلومات کے لیے سب سے بہتر کتاب امام ابن تیمیہ کی قاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ ہے، جلاء العینین ص ۳۱۵، ۲۶۹ میں بھی مفصل بحث ہے، اور فریقین کے دلائل جمع کردیے گئے ہیں،

مسئلے کی صحیح نوعیّت

ہمیں افسوس ہے کہ یہاں مولانا سندھی نے ابن عبدالوہاب اور مولانا شہید دونوں میں سے کسی کی ٹھیک ترجمانی نہیں کی، تقویۃ الایمان کا وہ ٹکڑا جس پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے، حسبِ ذیل ہے:-

"اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک نہ بخشا جاوے گا، جو اس کی سزا ہے مقرر ملے گی، پھر گر بڑے درجے کا شرک ہے، کہ آدمی جس سے کافر ہو جاتا ہے، تو اس کی سزا یہی ہے، کہ ہمیشہ ہمیشہ کو دوزخ میں رہے گا...... اور جو اس سے ورے ورے درجے کا شرک ہے، ان کی سزا جو اللہ کے یہاں مقرر ہے سو پاوے گا، اور باقی جو گناہ ہیں، ان کی جو کچھ سزائیں اللہ کے یہاں مقرر ہیں، سو اللہ کی مرضی پر ہے چاہے دیوے چاہے معاف کرے۔"

(تقویۃ الایمان ا ص ۳۰)

جہاں تک شرک کے غیر مغفور ہونے کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ مندرجۂ بالا عبارت سے شرکِ اصغر پر اصرار کرنے والوں کے مسئلے میں اختلافِ رائے کا شبہ ہوتا ہے لیکن تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے مطالعے اور مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکِ اصغر میں بھی دونوں کی رائیں ملتی جلتی ہیں، اہلِ نجد نے بھی ان مسلمانوں کی، جو شرکِ اصغر میں مبتلا ہیں، علی الاطلاق تکفیر نہیں کی [1] البتہ تارکینِ صلوٰۃ [2] اور مانعینِ زکوٰۃ کی طرح یہ ان لوگوں سے بھی قتال کے قائل ہیں، جو

---

[1] ومن جملة هذه الاكاذيب ماذكره ... ان شيخ الاسلام محمد بن عبدالوهاب يسفك الدماء ... ويتجارى على قتل النفوس ... وتكفير الامة المحمدية فى جميع الاقطار و هذا كله كذب (تبرئة الامامين ص ۸۵)

"اور ان کذب بیانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ شیخ الاسلام محمدؒ بن عبدالوہاب (خلق اللہ کا) خون بہاتے ہیں اور انسانوں کی جان لینے میں حد سے زیادہ جری ہیں اور دنیا جہان کے مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں ... . یہ سب جھوٹ ہے۔"

[2] تارکینِ صلوٰۃ کے بارے میں اہلِ نجد کے مسلک سے واقفیت کے لیے ملاحظہ ہو: الهدية السنية (ص ۸ - ص ۶۹)....

قبر پرستی اور تعزیہ پرستی وغیرہ (جسے شرکِ اصغر کہا جاتا ہے) میں مُبتلا ہیں۔ اور وہ بھی تبلیغ و فہمائش کے بعد۔ بالکل اسی طرح مولانا شہیدؒ بھی قبر پرستوں کو (یعنی ان مسلمانوں کو جو شرکِ اصغر میں مبتلا ہیں) مشرکینِ عرب سے کم نہیں سمجھتے

"یعنی شرک دو طرح ہوتا ہے، ایک تو یہ کسی کے نام کی صورت (مورت) بنا کر پُوجے، اس کو عربی زبان میں صنم کہتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ کسی نشان کو مانے یعنی کسی کے مکان یا درخت کو... کسی کے نام کا ٹھہرا کر پُوجے۔ اس کو عربی زبان میں وثن کہتے ہیں، اس میں داخل ہے، قبر اور کسی کا چِلّہ اور لحد اور کسی کے نام کی چھڑی اور تعزیہ اور عَلَم... کہ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں اور وہاں جا کر نذریں چڑھاتے اور منّتیں مانتے ہیں...... اور اسی طرح بعض مکان مرضوں کے نام سے مشہور کرتے ہیں...... غرض کہ یہ سب وثن ہیں، سو پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خبر دی ہے کہ مسلمان جو قیامت کے نزدیک مُشرک ہو جاویں گے، ان کا شرک اسی قسم کا ہوگا کہ ایسی چیزوں کو مانیں گے۔ برخلاف اور مشرکوں کے کہ جیسے ہندو یا مشرکینِ عرب کہ اکثر صنم پرست ہیں، یعنی مورتوں کو مانتے ہیں، سو دونوں مشرک ہیں، اللہ سے پھرے ہوئے رسول کے دشمن" (ص ۴۴-۴۳، تقویۃ الایمان)

یہ مفہوم ایک دُوسری جگہ اور صاف طور سے ادا ہُوا ہے۔

"اَور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور بندہ سمجھتے تھے۔ اور ان کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے، مگر یہی پکارنا اور منّتیں ماننی، اور نذر و نیاز کرنی، اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی ان کا کفر و شرک تھا، سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو کہ اس کو اللہ کا بندہ و مخلوق ہی سمجھے۔ سو ابو جہل اَور وہ شرک میں برابر ہے" (ص ۸-۷)

ہمیں بتایا جائے کہ شیخ الاسلام محمّد بن عبد الوہاب ان کے شاگردوں اَور ماننے والوں نے اس سے زیادہ کیا کہا ہے؟ اور کہاں کہا ہے؟ اسی لیے ہم نے اُوپر یہ کہنے کی جُرأت کی کہ مولانا سندھی نے اس مسئلے میں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کا بڑا استدلال حضرت ابوبکر صدّیق کی اس مستحکم روش سے ہے جو انہوں نے مانعین زکوٰۃ کے مقابلے میں اختیار کی تھی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تبرئۃ الشیخین الامامین من تزویر اھل الکذب والمین مرتبہ سلیمان بن سحمان نجدی)

یشخ محمد بن عبدالوھابؒ یا مولانا شہیدؒ دونوں میں سے کسی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کی، مولانا شہیدؒ کی کتاب تو سب کے سامنے ہے، اس لیے ان کے مسلک کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ باقی، رہا اہل نجد کا مسلک، سو اُسے راقم سیرت ابن عبدالوہاب میں اچھی طرح واضح کر چکا ہے۔ اہل نظر، خود اہل نجد کی تالیفات[۱] پڑھ کر کھرے کھوٹے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

یہ تھے "دو اساسی مسئلے" جن میں مولانا سندھی کے خیال کے مطابق تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے فتوے ایک دُوسرے کے "مناقض" ہیں، اور نجد و حزب ولی اللہ کے یہی وہ معرکۃ الآراء اختلافی مسئلے ہیں، جن کی بناء پر مولانا سندھی کا "ولی اللّٰہی" "نجد کے وہابی" سے تعاون نہیں کر سکتا۔

اب رہ گیا یمن اور حزب ولی اللہ کا اختلاف، سو اس کے متعلق کچھ تو امام شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن ایک دو باتیں رہ گئی تھیں، جی چاہتا ہے کہ وہ بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں، ہمارے مولانا نجد و یمن کا ذکر اس طرح ایک ساتھ کرتے آئے ہیں کہ گویا ان کے خیال میں ہندوستان اور "ولی اللّٰہیت" کے خلاف نجد و یمن کا ہمیشہ "متحدہ محاذ" رہا کیا ہے۔ اور شاید اسی لیے وہ نجدی اور یمنی دونوں تحریکوں سے یکساں برہم ہیں لیکن اسے ہم کیا کریں کہ واقعہ یہ نہیں، حسب ذیل گذارشات سے نجد و یمن کی دائمی یک رنگی کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

نجد و یمن کے "مُتّحِدہ محاذ" کی حقیقت

(الف) یمن کے نامور عالم محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) اُصول و فروع میں مجتہد تھے اس لیے کسی ایک فقہی مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی اور تقلید کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، ان کے برخلاف ابن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) حنبلی ہیں، اور حنابلہ میں بھی ان کا اعتماد زیادہ تر امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی تحقیقات و اجتہادات پر ہے،

(ب) ابھی ابھی نجد و ہند کے دو اختلافی مسئلوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے پہلے مسئلے (توسّل فی الدعاء

---

[۱] اجمالی رائے قائم کرنے کے لئے سلیمان بن سحمان نجدی کے مرتب کردہ مجموعے (الھدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوھابیۃ النجدیۃ) کا مطالعہ کافی ہوگا، جس میں پانچ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

ہیں امام شوکانیؒ، مولانا شہید کے ہم نوا ہیں ۔ وہ انبیاء اور تمام صالحین کی ذات سے توسّل جائز رکھتے ہیں ۔
والدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید (ص۲۰-۲۶)

(ج) دُوسرے مسئلے (شرکِ اکبر و اصغر) میں وہ اہلِ نجد کے ہم خیال ہیں (اگر مولانا سندھی کی رعایت سے اس مسئلے میں تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے درمیان ادنیٰ اختلاف بھی مان لیا جائے) قبر پرستی (عبادۃ القبور) اور بُت پرستی (عبادۃ الاصنام) کے درمیان فرق کرنے والوں پر انہوں نے سخت حملے کئے ہیں، (الدُّرر النضید، ص ۱۲-۴۰-۳۵)

(د) زمان و مکان کی قربت کے باوجود امام شوکانیؒ (۱۱۷۳ھ - ۱۲۵۰ھ) کو شیخ الاسلام ابن عبدالوہابؒ (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی دعوت کی صحیح نوعیت بھی نہیں معلوم ہو سکی تھی، البدر الطالع (ج ۲ - ص ۵) میں اُنہوں نے امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۷۹ھ - ۱۲۱۸ھ) کے کچھ حالات لکھے ہیں، تعریف کے ساتھ ساتھ یہ فقرہ بھی درج ہے۔

ولکنھم یرون ان من لم یکن داخلاً تحت دولۃ صاحب نجد و ممتثلا لاوامرہ خارج عن الاسلام .... (۲:۵)	"لیکن ان کا خیال ہے کہ جو فرمانروائے نجد کی حکومت میں داخل اور اس کے احکام کا تابعدار نہیں - وہ اسلام سے خارج ہے"

پھر انہیں خود اس بیان کی صداقت پر شُبہ ہوتا ہے اور یہ فقرہ اضافہ کرتے ہیں۔

... و تبلغ عنھم اشیاء اللہ اعلم بصحتھا۔	"اور ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں"

اِن تصریحات کی موجودگی میں نجدیین کی وحدت پر زور دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ اس تفصیل سے راقم یہ دکھانا چاہتا تھا کہ جس طرح شاہ ولی اللہ اور ابن عبدالوہابؒ یا شوکانیؒ کے درمیان بعض مسئلوں میں اختلاف ہے۔ اسی طرح شوکانیؒ اور ابن عبدالوہابؒ بھی ہر مسئلے میں مُتفق الرائے نہیں، اس لیے نجدیین کو ایک کہنا، اور دونوں کو ولی اللّٰہیّت کا مُناقض" بتانا صحیح نہیں، دنیا کی کوئی دو تحریکیں ہر ہر مسئلے میں متحد الرائے نہیں ہو سکتیں اور اہلِ علم کو جُزئی و فروعی مسئلوں میں سخت گیر نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ تحقیق کی راہ مسدُود ہو جائے گی۔

مسئلہ وحدت الوجود مسلکِ ولی اللٰہی کی بنیاد نہیں ہے

یہ بحث بھی ختم ہونے کو آئی، پر اس تقابل اور موازنے کے سلسلے کی ایک اہم بات رہ گئی، مختصر طور پر عرض کئے دیتا ہوں، ان دو اساسی مسئلوں کے علاوہ جن پر ابھی گفتگو ہو رہی تھی۔ ولی اللٰہیت اور بیرونِ ہند کی توحیدی تحریکوں کے درمیان ایک بنیادی فرق اور رہ جاتا ہے۔ جس پر مولانا سندھی کو بے حد اصرار ہے۔

"امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر مرتکز ہے۔ وہ امام ربانی کی وحدتِ شہود کو بھی وحدت وجود سے تطبیق دیتے ہیں۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وحدۃ الوجود کے ماننے والوں سے جس قدر شدید نفرت رکھتے ہیں، وہ دنیا کو معلوم ہے جب کہ دونوں تحریکوں کی ذاتیات میں اس قدر اختلاف ہو تو ان کو محض بعض امور کے اشتراک سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔ (ص ۱۳۴)

مولانا صحیح فرماتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) واقعی وحدت الوجودیوں سے شدید نفرت رکھتے ہیں۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ (ف ۱۱۷۶ھ) کسی نہ کسی درجے میں وحدت الوجود کو مانتے ہیں، بلکہ وہ ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) کی وحدۃ وجود اور امام ربانی (ف ۱۰۳۴ھ) کی وحدتِ شہود کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ کہنا کہ "امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر مرتکز ہے" تھوڑی سی توضیح چاہتا ہے۔ اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ ان کی دعوت اور تعلیمات کی بنیاد اور محور یہی فلسفہ ہے تو ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے۔ اور اگر یہ مفہوم ہے کہ شاہ صاحب اپنے علم و فضل اور درجۂ امامت کے باوجود اس خاندانی میراث (عقیدۂ وحدۃ الوجود) سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، تو صحیح ہے۔ او[ر] یہ واقعہ ہے کہ جس طرح فقہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا رجحان محاکمہ اور تطبیق کی طرف ہے۔ اسی طرح وحدۃ الوجود کے عقیدے میں بھی ان کی طبعی وسعتِ قلب اور خاندانی اثرات کے ساتھ تطبیق کا ذوق بھی کام کر رہا ہے۔ اِس لیے ہم عقیدۂ وحدۃ الوجود کو شاہ صاحبؒ کی ذاتیات میں تو شمار کر سکتے ہیں، مگر اسے مسلک ولی اللٰہی کی خصوصیت ماننے کے لیے تیار نہیں۔

سیدین شہیدینؒ بھی وجودیّت کے قائل نہیں تھے

اور تو اور خود شاہ صاحبؒ کے نامور پوتے مولانا شہیدؒ وجودیت کے قائل نہ رہ سکے بجفا[...]

تک تو وہ اپنے دادا کے نقشِ قدم پر معلوم ہوتے ہیں، لیکن بعد میں تکیہ رائے بریلی کے سید زادے کے فیضِ صحبت سے فلسفہ و تصوف کا یہ غیر مطبوع رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سید صاحب سے ان کی گہری وابستگی اور عقیدت (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے) کا تقاضا بھی یہی تھا، سید صاحبؒ کے متعلق مولانا سندھیؒ کا یہ قول نقل ہو چکا ہے کہ ان کے خاندان میں "حضرت مجددؒ سرہندی اور مجددؒ دہلوی کی برکتیں جمع ہو گئی تھیں" اور یہ کہ ان کا خاندان "اپنا خصوصی مشرب اور فکر رکھتا ہے۔" (ص ۱۴۵) اس لیے حضرت سید شہیدؒ تو امام ربانی مجدد الف ثانی (ف ۱۰۳۴ھ) کے مسلک[1] پر تھے ہی، مولانا شہیدؒ بھی ان سے متاثر ہوئے۔ جس پر صراطِ مستقیم کے اوراق گواہ ہیں، (ص ۵، ۱۲، ۱۳، ۲۶، ۴۵، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۰، الخ الخ) افسوس کہ جگہ کی تنگی زیادہ پھیلاؤ سے روکتی ہے۔ اس لیے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ جو شہیدین کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

"...... و از جملہ بدعات ملاحدۂ وجودیہ کہ در خواص و عوام اشتہار یافتہ و با اقوال اکابر طریقت مشتہر گردیدہ۔ گفتگو ہائے توحید وجودی الحادی است کہ بگمان اتحاد خود با خدا ازاں لذتہائے نفسانی برمیدارند و بتسویل شیطانی و مکر نفوس خبیثہ بیان آں گفتگو را معارف و حقائق می پندارند ولا اقل از حضرات آں اقوال اوقات عزیزۂ خود را بلاطائل محض صرف می نمایند۔ پیشوائے ما محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بآں امر نہ فرمودہ و ہرگز لب بہ بیان آں نکشودہ پس ما را ازاں چہ سود ....." (صراطِ مستقیم۔ ۴۵: مطبع مجتبائی، دہلی)

"توحید وجودی الحادی" اور "بدعات ملاحدہ وجودیہ" کے بعد امام ابن تیمیہؒ اور شہیدینؒ (اللہ ان کی تربت پر انوارِ رحمت کی بارش کرے) کے درمیان بہت کم فرق رہ جاتا ہے، اور خاکسار یہی دکھانا چاہتا تھا۔ باقی حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق ہم یہ عرض کر چکے کہ یہ عقیدہ ان کی ذاتیات میں ضرور داخل ہے لیکن مسلکِ ولی اللٰہی کی خصوصیت نہیں بن سکتا۔ و نہ حضرت سید صاحبؒ اور مولانا شہید کو مسلکِ

---

[1] حضرت مجدد الف ثانیؒ کا تصور توحید اور ان کا طریقِ فکر معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو: برہان احمد صاحب فاروقی کی کتاب

THE MUJADDID'S CONCEPTION OF TAUHID

اس میں حضرت شاہ صاحبؒ، سید صاحبؒ، مولانا شہیدؒ اور دوسرے بزرگوں کے مسلک پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔

ولی اللّٰہی سے خارج کرنا پڑے گا اور شاہ ولی اللہ کے ارہاص[1] امام ربّانی کے ارشادات بھی اس مسلک ولی اللّٰہی کے مناقض قرار پائیں گے، اور اگر مولانا سندھی کو اس پر اصرار ہے کہ حکمتِ ولی اللّٰہی کی اساس یہی وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہے، تو پھر ہمیں امام دار الہجرۃ سیدنا مالک بن انس (ف ۱۷۵ھ) کا مشہور قول

كل واحد يؤخذ منه ويرد عليه	"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص
الا صاحب هذا القبر صلى الله عليه وسلم	کے اقوال میں ردّ و قبول کی گنجائش ہے"

پڑھ کر بصد ادب اس "حکمتِ ولی اللّٰہی" سے برات کرنا پڑے گی، اس لیے کہ ہمارا مرجع کتاب و سنّت کے مقابلے میں کسی انسان کا خود ساختہ فلسفہ نہیں ہو سکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا مفکر اور عالم کیوں نہ ہو۔

سیّد نذیر حسین دہلویؒ پر وجودیّت کا الزام

اس وحدت الوجود کے سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سیّد نذیر حسین صاحب محدثؒ (میاں صاحب دہلوی) سورج گدھی مونگیری (م ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء - ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے متعلق مولینا سندھی کہتے ہیں کہ وہ بھی وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔

"مولانا نذیر حسین مولانا ولایت علی کے مدرسہ (صادق پور) پٹنہ کے ابتدائی طالب علم ہیں۔ بہار سے جب دہلی پہنچے تو الصدر الحمید اور ان کے اصحاب کی صحبت میں ہی علمی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ غزوۂ دہلی تک مولانا محمد اسحاق کے مسلک کے پابند رہے۔ اس کے بعد اگرچہ بہ ضرورت نجدی تحریک اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی طرف میلان ظاہر کرتے رہے مگر فتاویٰ عالمگیریہ کا مشغلہ اور ہدایہ کی تدریس اور وحدۃ الوجود کا فلسفہ ان کی پرانی ذہنیت کا عنوان آخر تک قائم رہا۔" (ص ۱۹۶)

جہاں تک وحدت الوجود کے عقیدہ کا تعلق ہے، یہ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میاں صاحبؒ اس کے قائل نہیں تھے۔ شیخ اکبر (ابن عربی) کی تعظیم وہ ضرور کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ

---

[1] امام ولی اللہ کی تحریک کے لیے اگر کوئی بزرگ سلف صالح کا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ فقط امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے وجود میں منحصر ہے، ان کو امام ولی اللہ اپنے طریقہ کا ارہاص مانتے ہیں ۔۔۔ (ص ۱۴۱)

تھی کہ ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) بھی تقلید شخصی کے سخت مخالف تھے (الہیات بعد الممات ص ۲۱۰) اور ان کی یہ ادا میاں صاحبؒ کو بہت پسند آتی تھی، اور اسی لیے وہ شیخ اکبر کی تکفیر کے مخالف تھے۔ مولانا سندھی نے الہیات بعد الممات کے حوالے سے قاضی بشیر الدین قنوجیؒ اور میاں صاحب کے جس مناظرے کا ذکر کیا ہے وہ ابن عربی کی تکفیر ہی کے مسئلے پر تھا، وحدۃ الوجود سے اس کا کوئی تعلق نہیں (الہیات بعد الممات ص: ۱۲۳) باقی ہدایہ کی تدریس، فتاوی عالمگیری کا مشغلہ اور شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے مسلک کی پابندی، تو یہ چیزیں ہمارے نزدیک ضمنی حیثیت رکھتی ہیں، یوں کون نہیں جانتا کہ ولی اللٰہیوں میں میاں صاحب کو مولانا شہید سے زیادہ عقیدت تھی، جس کا ذکر وہ بار بار کیا کرتے تھے (الہیات بعد الممات ص ۱۶۷) میاں صاحب کے مسلک کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (الہیات بعد الممات ص ۵۴، ۵۶، ۱۲۳، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۰۷)

خاکسار کو مولانا عبید اللہ سندھی کی زیرِ نظر کتاب (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک) سے متعلق جو کچھ عرض کرنا تھا، عرض کر چکا، یہ فیصلہ کرنا تو اس وقت عاجز کے لیے بہت مشکل ہے کہ اس سے کہاں کہاں لغزشیں ہوئی ہیں، البتہ اپنی کوشش یہی رہی ہے کہ واقعات اور مسئلوں کی زیادہ سے زیادہ چھان پھٹک کر لی جائے، پھر بھی اہل نظر سے درخواست ہے کہ وہ کوتاہیوں اور لغزشوں کی نشان دہی میں بخل نہ کریں، تحقیقی طور پر جو رہنمائی کی جائے گی وہ شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

یہ گذارش خاص طور پر اس لیے بھی کی جا رہی ہے کہ راقم چند سالوں سے سید شہیدؒ اور ان کی دعوت تجدید و جہاد پر کچھ چھان بین کر رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھا خاصہ مواد بھی فراہم ہو چکا ہے۔ لیکن بعض گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں ترتیب و تبویب اب تک شروع نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے اس درمیانی منزل میں بزرگوں کی ہدایتیں اور دوستوں کے مشورے بہت کارآمد ہو سکتے ہیں۔

سندھی فلسفے کی معجون مرکب کے کچھ اور زہریلے اجزاء

خیر راقم کو جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ تو عرض کر ہی چکا، لیکن اس کے بعد بھی سیاسیات و مذہب و فلسفہ کے اس معجونِ مرکب میں مسموم اجزاء کی کمی نہیں، اوّلاً تو فلسفہ و سیاست و مذہب کے اس معجون کا اصل نسخہ ہی غلط ہے مگر خاکسار اس کی تحلیل پر قادر نہیں کہ اس کے لیے طب ولی اللٰہی میں حذاقت ضروری ہے۔ اور بدقسمتی سے یہ حقیر شاہ صاحب کی تصنیفات پر بہت سرسری نظر رکھتا ہے، لیکن اصل نسخے THESIS

کے علاوہ بھی اس معجون میں کچھ زہریلے اجزار موجود ہیں، جن کی تحلیل کی ضرورت نہیں، وہ اتنے "زہریلے" ہیں کہ ان کا نگاہوں کے سامنے لے آنا کافی ہے۔

"جو قومیں انگریزی فوج میں ملازمت کر کے اور یوروپین طریقے پر سپاہی بننا نہیں سیکھیں گی۔ وہ ہندوستان کی آیندہ حکومت نہیں سنبھال سکتیں ہیں۔ باوجود ہزار ہا اختلافات کے سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب کی ہمیشہ تائید کرتا ہوں کہ وہ میری قوم کو فوج میں بھیجنے کا حامی ہے، اسّی میں نوّے فی صدی افراد جنگ میں مر سکتے ہیں، مگر دس جو واپس آئیں گے وہ ہمارا اصل سرمایہ ہوگا۔"

اور سنیے :۔

"ہم عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیں، اس کے بعد اس کو ترکوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھانا چاہیئے۔ اب ترکوں نے اپنا قومی طریقہ یورپین ازم بنا لیا ہے۔ ہم اس مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے پر اپنی قوم کو تیار کرنا چاہتے ہیں، ان حقائق سے ہمارے بڑے بڑے عالم ناواقف ہیں۔"
(ص ۸۰)

خیر اس وقت کے بڑے بڑے عالم ناواقف ہوں، تو کوئی حرج نہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی ان حقائق سے ناواقف تھے۔ پتہ نہیں حجۃ اللہ البالغہ کے کس باب میں "مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے" کی تلقین کی گئی ہے، کیا مسلم قوم بھی ہندو قوم کی طرح کوئی پیدائشی قوم (NATION) ہے۔

اسی سلسلے کا ایک اور وعظ ارشاد ہوتا ہے :۔

"یورپ کے طریقے پر کاشت کاروں کو عالم بنایا جا سکتا ہے، سب سے پہلے انہیں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے، اس کے لیے ہمارا عربی رسم الخط ایک مانع قوی ہے کہ ایسے انسان کو جو چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے، اس کو یہ خط سکھانا جو ایک ایک حرف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے، سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لیے بے حد دشوار ہے۔ رومن حروف جو علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ

حرف شناسی کے بعد ساری عمر کے لیے انسان فارغ ہو جاتا ہے۔" (ص ۸۱)

آخر میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے حزب کو مخالف عناصر سے قطعی پاک کرنے کی جو تجویز ص ۲۰۲ کے متن اور خصوصًا حاشیہ میں پیش کی گئی اور یورپ کی پارٹیوں کے طریق کار سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ کیا اسلام کی تعلیم ہے۔؟

میرے نزدیک کتاب کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر حضرت حاجی امداد اللہ بلکہ مولانا محمود حسن صاحب تک یہ تمام اکابر اُمّت درحقیقت صرف سیاسی لیڈر اور سیاسی مفکر تھے۔ اور ان کی بزم میں دین وملت اور ایمان والقان صرف فانوس (گلوب) تھا، شمع نہ تھی، صاف یوں کہیے کہ سیاست اور فکر انقلاب کی حقیقت پر دینداری اور حکمتِ ایمانی فقط بطور غلاف تھا، کیا ان بزرگوں کی بزرگی کی یہی حقیقی تصویر ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار،

اَب یہ عاجز طولِ کلام کی معافی چاہتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔

کتابِ دوم

”مولانا عبید اللہ سندھی“

پر

ایک ناقدانہ جائزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبید اللہ سندھی[1]

پر

ایک ناقدانہ جائزہ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی شخصیت ایک عجیب و غریب شخصیت ہے۔ اور ان کے افکار ان کی شخصیت سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اسلام قبول کیا۔ دیوبند میں تعلیم پائی، سیاسیات میں داخل ہوئے، اور اس طرح کہ ہندوستان چھوڑنا پڑا، جلاوطنی کی زندگی کابل، ماسکو، انقرہ اور یورپ کے مختلف مقامات میں گذری، آخر میں حجاز آگئے تھے۔ دس بارہ برس حرم کے سائے میں بھی رہے۔ اور اب پانچ سال ہوتے ہیں کہ وطن کی کشش پھر انہیں ہندوستان کھینچ لائی ہے۔

مولانا کی زندگی کوئی پُرسکون زندگی نہیں رہی ہے۔ دُنیا کے تمام نشیب و فراز، دُکھ سکھ اور رنج و محن کی گھاٹیوں سے وہ کامیاب گذر چکے ہیں، اور اب کہ سفینۂ عمر ساحل کے قریب آلگا ہے، وہ اپنے تجربات

---

[1] مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے حالات اور اُن کے افکار پر یہ کتاب، ان کے افکار سے متاثر پروفیسر محمد سرور (متوفی ۱۹۸۳ء) اُستاذ جامعہ ملیہ دہلی نے لکھی تھی جو سندھ ساگر اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اسی کتاب کا ایک اجمالی جائزہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اس کتاب میں لیا ہے جو اب قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ (ص۔ ی)

زندگی اور نصف صدی کے مطالعے کے نتائج سے ہمیں مستفید کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان آنے کے بعد پہلے پہل انہوں نے کلکتہ میں ایک تقریر کی، جس سے ہمارے حسنِ ظن کو جھٹکا لگا۔ اس میں انہوں نے انگریزی لباس زیب تن کرنے اور لاطینی حروف اختیار کرنے کی تلقین کی تھی، ظاہر ہے کہ صرف "صاحبوں" کا لباس اختیار کر لینے سے انسان "صاحب" نہیں ہو جاتا۔ اور نہ لاطینی حروف برت لینے سے سائنس و فلسفہ کے اسرار کھل جاتے ہیں، یہ ایک سطحی اور مرعوب ذہنیت کی دعوت تھی۔ اور مولانا سندھی کی زبان سے ایسی باتیں سن کر طبعی طور پر بڑا دکھ ہوا۔

اس کے بعد الفرقان ولی اللہ نمبر (۵۹ھ) میں انہوں نے امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف کرایا" گو اس میں بھی بہت سی باتیں قابلِ گرفت تھیں، مگر دوستوں نے یقین دلایا کہ "مولانا اپنے افکار کے اظہار" پر قادر نہیں، اور ان کا حال کچھ فرقہ ملامتیہ کا سا ہے، شروع شروع میں وحشت ہوتی ہے۔ "پھر انسان مانوس ہو جاتا ہے" ـــــ ہم نے جی کڑا کر کے اس "اجمالی تعارف" کا بار بار مطالعہ کیا، مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری طبیعت اس سے مانوس نہ ہو سکی۔ "نیشنلزم" کی تبلیغ خواہ کتنے ہی معصومانہ انداز میں ہو، ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔

اس "ہلکے سے تموج" کے بعد مولانا نے "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" لکھی (۱۳۶۲ھ) جس میں حضرت سید احمد شہید بریلوی، اہل صادق پور اور ان کے عام ماننے والوں پر انہوں نے نہایت سخت اور ناروا حملے کئے، ساتھ ساتھ نجد اور یمن کے مشہور اہلِ علم اور نامور محدثین کو بھی اس سلسلے میں دھر گھسیٹا، اس کتاب پر ایک مفصل تنقید "معارف" کے چار نمبروں (فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۳۴۳ء) میں شائع ہو چکی ہے، جو اہلِ علم میں قبولیت کی نظروں سے دیکھی گئی[1]

---

[1] یہ وہی مضمون ہے جو پہلے "معارف" میں "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ـــ استدراک و تنقیح" کے نام سے چھپا۔ پھر یہ مضامین کتابی شکل میں "مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" کے عنوان سے پٹنہ سے شائع ہوئے، اور یہی وہ کتاب ہے جو قارئین ـــ صادقین صادق پور اور علمائے اہل حدیث ـــ مولانا عبید اللہ سندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ ـــ کے عنوان سے گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ (ص ۔ ی)

یہ کتاب، اور الفرقان کا مقالہ، دونوں اہلِ علم اور خواص کے لئے تھے، عام اور معمولی لکھے پڑھے لوگ ان سے اچھی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لئے ان کا دائرۂ اثر و نفوذ بہت محدود رہا۔ ان کے برعکس زیرِ نظر کتاب مولانا کے ایک لائق شاگرد اور معتقد نے آسان زبان میں لکھی ہے جس میں ان کے تمام افکار یکجا اور پھیلا کر پیش کئے گئے ہیں، طرزِ بیان دلچسپ اور مؤثر ہے، واقعات تاریخی تسلسل اور افکار سلجھاؤ کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، غرض جہاں تک مولانا کے افکار و آراء کا تعلق ہے۔ یہ کتاب ان کے پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اور ہمیں یہ معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اس کتاب سے بالکل مطمئن ہیں - یہ دوسری بات ہے کہ یہ افکار کتاب و سنّت کی روشنی میں کہاں تک قابلِ قبول ہو سکتے ہیں؟

کتاب تقریباً چار سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور تقریباً پوری اسلامی تاریخ پر مولانا کا تبصرہ اس میں آگیا ہے۔ وحدتِ انسانیت، انقلاب، اسلامی تصوّف، اسلامی افکار میں قومی و ملکی رجحانات، اسلامی ہندوستان، اکبر اعظم، اورنگ زیب، شاہ ولی اللہ اور ولی اللہی سیاسی تحریک، مختلف ابواب کے ماتحت مولانا کے خیالات و افکار کی تشریح کی گئی ہے۔

مصنّف کا مقدّمہ بھی اچھا خاصہ دل آویز اور دلچسپ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اس وقت کیسی ذہنی کش مکش اور فکری الجھاؤ میں گرفتار ہے۔

مولانا کے افکار کی تنقید اور مکمل جائزے کے لئے بڑی فرصت اور پھیلاؤ کی ضرورت ہے۔ افسوس کہ نہ اس وقت ہمیں اتنی فرصت نصیب ہے، اور نہ ایک رسالے کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش ہے، سرسری طور پر ہم اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ مولانا سندھیؒ اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجونِ مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسلمان خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں، اسی اعتبار سے وہ وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان کے قائل ہیں۔ مولانا کے نزدیک قرآن مجید بھی اسی "بنیادی فکر" کا ترجمان ہے۔

"اور یہ بنیادی فکر عالمگیر، ازلی، ابدی اور لازوال ہے۔ قرآن میں بے شک اس کا جامہ عربی ہے" (ص ۳۵)

لیکن یہ "عربیت"، "مشاہدۂ حق" کے بیان میں صرف "ساغر و مینا" کے طور پر ہے (ص ۳۵) اصل حقیقت تو وہی ہے، جو گیتا میں ہے، مولانا کے نزدیک گیتا حق ہے، لیکن اس کی جو غلط تعبیر کی گئی

ہے۔ وہ کفر ہے، گیتا کے متعلق تو گیتا والے جانیں۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مولانا کی "وحدت انسانیت کا شارح ہے"۔ اور نہ وہ "وحدتِ ادیان" کا قائل ہے۔ اس کا حامل تو ایک "دینِ حق" اور "ھدیٰ" لے کر آیا تھا، تاکہ ساری کائنات اس کی پابند ہو۔ اور اللہ کی زمین پر اسی کا قانون نافذ ہو۔ مولانا جن قوانین و مذہبی اقتدار کو "رسوم" کہتے ہیں، وہ صرف رسوم نہیں، ان میں "حدود اللہ" بھی ہیں۔ اور "حدود اللہ" سے تجاوز کرنے والے کے لئے قرآن مجید کا لہجہ سخت ہے۔

لیکن ہمارے مولانا تو "دینِ حق" کی دائمی برتری گویا مانتے ہی نہیں، ان کے نزدیک اب "قرآنی حکومت" کا زمانہ گزر گیا اور گذری ہوئی چیز واپس نہیں آسکتی۔

"جو زمانہ گذر گیا، پھر وہ واپس نہیں آیا کرتا، جو پانی بہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں، قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دورِ اول میں صحابہ نے جو حکومت بنائی۔ اب بعینہٖ ویسی حکومت نہیں بن سکتی۔ جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے ہیں وہ حکمتِ قرآنی کے صحیح مفہوم کو نہیں جانتے۔ بے شک خلافتِ راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا نمونہ ہے، لیکن یہ نمونہ بعینہٖ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا" ص۴

"حکمتِ قرآنی" سے مولانا کی جو بھی مُراد ہو۔ مگر ہم اسے 'شریعت' سے الگ نہیں سمجھتے جو حکمت شریعت سے بے نیاز کر دے یا شریعت کو قرارِ واقعی اہمیت نہ دے، "قرآنی حکمت" نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا کے افکار میں یہ چیز بُری طرح کھٹکتی ہے کہ وہ اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔

"مولانا نے فرمایا کہ میں دین کو اسی بناء پر انسانیت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر فردِ انسان کی انانیت بیدار ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے یا اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دینِ حق مان لیا ہے اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا، اس کو کافر قرار دیا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ دین کا جو مقصودِ حقیقی ہے وہ ان کے ہاتھ آتا بھی ہے یا نہیں"

جانے، ظاہری طور طریقوں، سے مولانا کی مُراد کیا ہے؟ کیا نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ کی ادائی، حج ادا کرنا، یہ سب ظاہری طور طریقے ہیں؟ اور جو ان کا قائل نہ ہو، وہ ربّ العٰلمین کی بارگاہ میں مقبول

ہوسکتا ہے۔؟ اور پھر ہمیں بتایا جائے کہ "محدود مذہب" سے مُراد کیا ہے؟ کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے۔

اسلامی تصوّف کے باب (ص ۱۲۴-۱۶۳) میں مولانا کا بیان بہت دلچسپ، مفید اور سبق آموز ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ موجودہ ہندی تصوّف کا بڑا حصہ ویدانت اور ہندو یوگیوں کے طریقوں سے ماخوذ ہے۔ "اصل جذبۂ تصوّف" جسے حدیث میں "احسان" کہا گیا ہے یقینی خالص اسلامی چیز ہے لیکن موجودہ فنِ تصوّف، تزکیہ اور ریاضت کے نت نئے طریقے، بیرونی اثرات کی غمازی کرتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں۔

"ہمارے بعض علماء اس سے بہت چڑتے ہیں۔ انہیں یہ گراں گذرتا ہے کہ مسلمان صوفیاء نے ہندوستان کے ویدانت سے استفادہ کیا، چنانچہ وہ ایسے تصوّف کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں؛ .... ان اربابِ علم وفضل کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ ایک ہے جذبۂ تصوّف، اور ایک ہے علمِ تصوّف، اس جذبۂ تصوّف کو حدیث شریف میں احسان کا نام دیا گیا ہے .... اور جس طرح اور علوم کی تدوین میں دوسری قوموں کی تحقیقات اور تلاش وجستجو سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح تصوّف کے طرق میں بھی دوسری قوموں سے استفادہ کیا گیا۔" (ص ۱۳۰-۱۳۱)

"اسلامی تصوّف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے" (ص ۱۳۱)

"یہاں پر ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی تصوّف ویدانت کے فکر سے متاثر ہوا۔ اور ہندوستان کے مسلمان صوفیا نے نفسِ باطنی کی اصلاح اور تصفیہ کے لئے ہندو یوگیوں سے ملتے جلتے طریقے اختیار کیے" (ص ۱۳۲)

بہرحال حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے، رہے ہمارے صوفی علماء، تو ان کی خفگی بجا ہے۔ یہ بزرگانِ دین، اور اللہ کے مرتاض بندے ان صوفیانہ ریاضتوں کو خالص اسلامی چیز سمجھتے ہیں۔ جب آپ کہیں گے کہ یہ چیزیں ہندوؤں سے لی گئی ہیں تو ان کا نفس طبعی طور پر اس تلخ حقیقت کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔

لیکن مولانا کا مطلب دوسرا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمان صوفیوں نے ہندو یوگ کو منقح کیا۔ اس کی اصلاح کی، اور پھر اسی کو پاکیزہ شکل میں ہندوؤں کے سامنے پیش کیا۔

"یہی وجہ ہے کہ ہمارا تصوّف ہر سمجھدار ہندو کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ اگر فرقہ وارانہ تعصبات نہ ہوتے اور ہندوؤں کے دلوں میں مسلمان کی ہر چیز سے نفرت نہ پیدا کردی جاتی، تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمان عارفین کے فیض سے ہر ہندو کے دل میں اسلامی تصوّف گھر کرلیتا۔ اور ہندوستان کے سمجھدار طبقے اسلام کے گرویدہ ہوجاتے"۔ (صٓ۱۳۲)

مگر سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ فرقہ وارانہ تعصبات شروع سے موجود ہیں اور ہندوستانی قومیت سے میل کی کوئی کوشش بھی ہندوؤں کو اسلام سے قریب نہیں لا سکتی۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے، کہ اس کھینچا تانی میں کچھ اسلام ہی کا رنگ پھیکا پڑجائے۔ یہ کوئی خواہ مخواہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اکبر اور داراشکوہ کی نامبارک کوششوں کا یہی انجام نہیں ہوا۔؟

اسلامی تصوّف کی طرح تاریخِ اسلام کا بھی مولانا نے اپنے نقطۂ نظر سے نہایت گہرا جائزہ لیا ہے۔ اُن کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ:۔

"اسلام گو بین الاقوامیت کی دعوت ہے۔ مگر وہ قومیتوں کا انکار نہیں کرتا"۔ (صٓ۱۹۶)

وہ انسانیت، بین الاقوامیت اور قومیت تینوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ عقیدۂ وحدۃ الوجود ان کے انسانی فکر کا ترجمان اور مظہر ہے۔ بین الاقوامیت کی جگہ وہ وحدتِ ادیان کو دیتے ہیں۔ قومیت کی تعبیر وہ خاص دین یا شریعت سے کرتے ہیں، وہ بیک وقت ان تینوں چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

"عقیدہ وحدۃ الوجود، وحدتِ ادیان اور ایک مستقل دین کی جو بالترتیب جُداجُدا حیثیتیں ہیں۔ ان کی وضاحت کرتے ہُوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ ان کی مثال انسانیت، بین الاقوامیت اور قوم کی ہے، میں انسانیتِ عامہ پر عقیدہ رکھتا ہوں، اور اسی بناء پر میں بین الاقوامیت پر بہت زور دیتا ہُوں، لیکن انسانیت اور بین الاقوامیت پر عقیدہ رکھنے سے میرے نزدیک یہ لازم نہیں آتا کہ قوم کے مُستقل وجود کو نہ مانا جائے۔ قومؔ، بین الاقوامیت اور انسانیت، ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بعینہٖ میرا شخصی عقیدہ، میرا قومی اور ملی مذہب، وحدت ادیان اور وحدت الوجوُد، ذہنی ارتقاء کے مراحل ہیں ..... صٓ۱۵۱

گویا اسلام کی حیثیت آپ کے نزدیک صرف ایک قومی و ملی مذہب کی رہ گئی، وہ ایک "عالمگیر دین" نہیں رہا۔ ——— لکھتے ہُوئے جی کڑھتا ہے، پر کیا کیا جائے کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ایسا ہی کچھ سمجھ میں

آتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہماری ناقص سمجھ کا قصور ہو۔

اسی قومیت اور وطن پرستی کے نشے میں مولانا عربوں اور عربی زبان اور "عربی قرآن" کے بارے میں ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو ہمارے نزدیک اسلام کی رُوح کے سراسر خلاف ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"۔۔۔۔۔۔ بے شک ۔۔۔۔۔۔ قرآن کا پیغام سب قوموں کے لئے تھا لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب ہو جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک قومی اور دوسری عمومی اور بین الاقوامی" (ص ۱۹۱)

"۔۔۔۔۔۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی متن کی تلاوت کرنا ثواب ٹھہرا"۔۔۔۔۔ (ص ۱۹۲)

فہم قرآن پر زور دینا اور بات ہے، اور تلاوت کے ثواب سے محروم کرنا دوسری بات ہے۔ غالبًا مولانا "تلاوتِ قرآن" کے ثواب کے منکر نہیں، عربی برتری اور عربی تفوق کی تردید میں شاید ان کی زبان سے نکل گیا ہو۔

"اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا۔ وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے، اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے، وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو، وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے، مولانا کے خیال میں یہ ناممکن ہے (ص ۱۹۶)

"اسلام کی دعوت "لاقومیت" کی دعوت نہیں تھی بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کے مرکز بن گئے" (ص ۲۰۰)

ایک مُسلم کی حیثیت سے ہمیں مولانا کے اس "فکر" کے قبول کرنے سے انکار ہے۔ اسلام قومیتوں کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہی نہیں، اسلام قومیت کی تعمیر نہیں کرتا۔ وہ "حزب" کی تشکیل کرتا ہے۔ اسلام نے چند "اصول و مبادی" پیش کئے ہیں، جو انہیں قبول کرتا ہے، ان پر ایمان رکھتا ہے، اور انہیں اپنی زندگی کا دستور العمل بناتا ہے، وہ اس "حزب" کا رکن ہے، یا یُوں کہیئے کہ وہ اسلام کی بین الاقوامی برادری میں شامل ہو جاتا ہے نسل اور جغرافیہ والی قومیت کا تصوُّر بھی اس کے قریب نہیں پھٹکنے پاتا۔ اصل یہ ہے کہ مولانا کے دل و دماغ پر رُوس اور اسٹالن چھائے ہوئے ہیں، جس طرح اسٹالن، اشتراکیت کے اصُولوں میں ترمیم کر کے اسے قومی رنگ دینے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہمارے مولانا بھی اسلام کو قومی لباس پہنانا

چاہتے ہیں، وہ ایسی قومی پارٹی بنانا چاہتے ہیں جو بین الاقوامی رجحان رکھتی ہو۔ اسی لیے وہ ٹرونسکی جیسے "مومن قانت" اشتراکی کے مقابلے میں "اسٹالن جیسے ہوشیار اور زمانہ ساز کو پسند کرتے ہیں۔ ...... یہ سب کچھ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں؛ زیر نظر کتاب میں پورے نو صفحے (صفحہ ۲۲۹-۲۳۰) اسلام اور اشتراکیت کی مماثلت کے نذر کئے گئے ہیں، افسوس کہ مضمون کی تنگ دامانی، طول طویل اقتباس کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے صرف اس کا ابتدائی حصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں! جس میں اس "مشابہت و مماثلت" سے برات ظاہر کی گئی ہے:۔

"حاشا وکلا، ہمارا مقصود یہاں کسی قسم کا مقابلہ کرنا نہیں ہے، اور نہ کسی طرح کی مشابہت ثابت کرنے کی غرض ہے، لیکن تاریخ اسلام کے ان ادوار کو سمجھنے میں اس زمانے کی ایک اور بین الاقوامی تحریک سے بڑی مدد مل سکتی ہے؛ خوش قسمتی سے یہ تحریک ہمارے سامنے اٹھی، ابھری اور پھیلی، اور مختلف مراحل سے گزری ہے...... ہماری مراد اشتراکیت کی تحریک سے ہے۔" (صفحہ ۲۲)

غرض تو "مشابہت" ثابت کرنے کی نہیں ہے، لیکن اسلام کے تاریخی ادوار کو آپ دیکھتے ہیں اشتراکیت ہی کی تاریخ کی روشنی میں، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں بھی ایک موقع (صفحہ ۱۳۳) پر یہ مماثلت پیش کی گئی ہے۔

اس قومیت کا فیض ہے کہ مولانا سندھی کی آزاد طبیعت پر تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کی تنقید بھی شاق گزرتی ہے، "بدقسمتی" سے ہندوستان کے ممتاز مسلمان اہل قلم بھی "عربیت" کے دلدادہ ہیں، اس لیے ان سے بھی ہمارے مولانا خوش نہیں ہیں:۔

"......ان کے (یعنی عربوں کے) اہل قلم نے تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کو ہمیشہ زوال، نکبت اور بے دینی کا عہد ثابت کیا، اسلام کی تاریخ کا یہ تصور ٹھیک نہیں، ہماری بدقسمتی ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان اہل علم میں سے جن لوگوں نے بھی تاریخ اسلام پر کتابیں لکھیں، وہ عربی تصنیفات سے بہت متاثر ہوئے، اور چونکہ عربی زبان کو ہمارے ہاں مقدس سمجھا جاتا ہے اور اس زبان میں جو کچھ بھی لکھا ہوا ہو، اس کو الہام کا درجہ دیا جاتا ہے، اس لیے یہ خیال ہندستان کے اہل قلم میں بھی عام ہو گیا۔" (صفحہ ۲۴)

ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں کہ عربی زبان میں لکھی ہوئی ہر چیز کہیں بھی "الہامی" نہیں خیال کی جاتی۔ عربی زبان میں الہامی اور مقدس چیز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے کتاب اللہ، جس کے تقدس سے شاید دین کو بھی انکار نہ ہو۔ رہی تاریخ اسلام کے بعض غیر عربی ادوار کی تنقید و تنقیص۔ تو اس کے ذمہ دار وہ بھی ہیں جو اسلام کی صراطِ مستقیم سے دُور جا پڑے۔

قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ اچھے خاصے ہوشمند مفکر اور وسیع النظر عالم کو راہِ اعتدال سے کتنا دُور لے جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مولانا کے ان خیالات سے ہو سکتا ہے جو زیرِ نظر کتاب میں "اسلامی افکار میں قومی اور ملکی رجحانات" کے عنوان سے مرتب کئے گئے ہیں۔ (ص ۲۴۲، ص ۲۴۲)

"یہ صحیح ہے کہ دینِ اسلام کسی ایک ملک، قوم یا زمانہ کے لئے مخصوص نہیں، اسلام تمام انسانیت کا دین ہے اور قرآن کریم انسانیت کے اسی دین کا ترجمان (اور قانون) ہے"۔

"اس عالمگیر قانون کو حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ جامہ اس عالمگیر قانون کی ایک تعبیر ہے، جو زمانہ، ماحول اور اہلِ حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی۔ اس تعبیر کو اصل قانون کی طرح عمومی اور ابدی سمجھنا ٹھیک نہیں"۔ (ص ۲۴۲)

آپ سمجھے یہ "حجازی تعبیر" کیا چیز ہے؟ ہم سیدھے سادے مسلمان تو اسے محض "حجازی تعبیر" کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس کا اصلی نام سنت ہے۔ جو قرآن پر "زاید" تو نہیں لیکن اس کی تفصیل و تشریح ضرور ہے۔ ائمہ اسلام "سنت" کو کتاب اللہ سے الگ نہیں قرار دیتے بلکہ اسی کا تتمہ سمجھتے ہیں۔

اس مولانا فرماتے ہیں:-

"دین صرف قرآن میں منحصر ہے۔ اور قرآن ہی دین کا قانونِ اساسی ہے ......
اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہے گی، لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ قانون اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم "سنت" انہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں"۔

"سنّت" مولانا کے نزدیک حجازی یا مدنی سوسائٹی کی ترجمانی ہے، اس لیے اس میں ان کے نزدیک تبدیلی ہو سکتی ہے، "یہ نظرِ عنایت" "سنّت" ہی پر بس نہیں کرتی، بلکہ اس کے بعد ایک قدم آگے بڑھ کر وہ قرآن کے احکام کو بھی ابدی اور عالمگیر نہیں مانتے۔

"مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں، عرب کے خاص حالات میں قرآن کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی عملی صورت دی جا سکتی تھی" (ص ۲۵۴)

ایک دوسرے انداز میں اس کی تشریح ملاحظہ ہو۔

"مولانا فرماتے ہیں کہ نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول ہی سے بنتی ہے مثلاً ہندستان میں فطرۃً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں اس لیے اگر کوئی ہندستانی ذبح حیوانات سے بچے (یعنی اپنے اوپر حیوانات کا گوشت حرام کرلے)، تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہ ہوگا" (ص ۲۵۵)

یہ سب اسی جذبۂ وطن پرستی کے مظاہر ہیں، جو مولانا کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جس کی کھوج میں انہوں نے مسلمانوں کی پوری تاریخ کھنگال ڈالی ہے۔

احکامِ قرآنی کی تبدیلی اور تغییر کے متعلق ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو، جو بالکل واضح ہے، اور کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔

"غیر عرب اقوام کے لیے اس پیغام (یعنی قرآن کریم) کو جو بظاہر عربی شکل میں تھا، اپنانے میں جو دقتیں پیش آئیں، انہیں دو طرح سے حل کیا گیا۔ عربوں کو دوسری قوموں پر حکمرانی حاصل ہو گئی تھی، ان قوموں کے عوام نے تو شریعت کو اس لیے مان لیا کہ یہ حکمرانوں کا قانون تھا........ البتہ دوسری قوموں کے خواص کے لیے اس قانون کو اپنانے میں جو رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یوں دور ہو گئی کہ اس قانون میں لچک تھی، غیر عرب اقوام کے خواص کو اجازت تھی، اگر وہ چاہیں تو عربی قانون کو بجنسہٖ قبول کر کے عرب بن جائیں یا اس کی روشنی میں اپنے لیے ایک قومی قانون بنا لیں"۔ (ص ۲۶۱)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ "لچک" سے مولانا کیا مُراد لیتے ہیں؟ پھر اگر "لچک" کی تاویل بھی کر لی جائے تو "قومی قانون" کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، رہ رہ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ سب اسی "وطنیت" کے جراثیم ہیں، جو مولانا سندھی جیسے دیدہ ور اور نکتہ رس عالم کو کعبہ سے ترکستان کی طرف لیے جا رہی ہے، اُن کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں۔ عارفؔ سیالکوٹی نے کتنا سچ کہا تھا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے (اقبالؔ)

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، راقم اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھا تھا کہ جذبۂ وطنیت کی بھی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہوگی، مگر مولانا سندھی کے "افکار و سیاسی تعلیمات" سے واقفیت کے بعد اس خیال کی غلطی آشکارا ہوگئی، مسئلہ خلقِ قرآن اور اس کی "قومی تشریح" پر مولانا نے جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں، ان کو پڑھ کر یقین ہوگیا کہ اس جذبۂ وطن پرستی کی کوئی حد نہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی فتنہ سامانیاں کہاں جا کر دم لیں گی، ممکن ہے بعض سیدھے سادے عقیدت مندوں کو یہ جملے ناگوار معلوم ہوں، مگر راقم ان سے ذرا صبر کی درخواست کرے گا آئیے ذرا جی کڑا کر کے مسئلہ خلقِ قرآن کی "قومی تعبیر" سن لیجئے، اس کے بعد آپ کو فیصلے کا حق ہوگا۔ اب تک اشتراکیوں کی یہ خصوصیت مشہور تھی کہ وہ دنیا کی تاریخ کی تعبیر معاشی عوامل کے ذریعے کیا کرتے ہیں مگر اب معلوم ہوا کہ وہ اس خبط میں منفرد نہیں، ہمارے بعض اربابِ فکر کا بھی یہ کمال ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کی تشریح و تعبیر "قومی نقطۂ نظر" سے کر لیتے ہیں: ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

"مامون کے زمانے میں خلقِ قرآن کا بھی مسئلہ اٹھا، ایک گروہ کہتا تھا کہ کلامِ الٰہی جو خدا کی صفاتِ قدیمہ میں سے ہے۔ وہ تو قدیم ہے، لیکن جو الفاظ آنحضرتؐ پر نازل ہوتے تھے، وہ مخلوق اور حادث تھے، محدثین کہتے تھے کہ کلامِ الٰہی ہر حال میں قدیم ہے"۔ مامون نے پہلے گروہ کی حمایت کی اور اس خیال کو سلطنت کا اصولی مسئلہ بنا دیا، اور محدثین کی قیادت امام حنبل (احمد بن حنبلؒ) نے فرمائی، خلقِ قرآن کے اس نزاع کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ مامون کے زمانے میں عربوں کے ہاتھ سے سیادت کے سب ذرائع چھن چکے تھے، لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی اور اب وہ اسے خاص الٰہی زبان منوانے پر مصر تھے، عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم تو من جانب اللہ مانتے تھے، لیکن قرآن کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور غیر فانی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، عربی الفاظ پر زور دینے والے حقیقت میں عربی تفوق کے قائل تھے"۔۔۔۔۔۔

محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا جائے، اور یا اس مسئلے کو گول ہی رکھا جائے کیونکہ عربی الفاظ کو مخلوق ماننے سے عربی تفوّق پر زد پڑتی تھی (ص ۳۶)۔

ان افکارِ زرّیں کو پڑھیئے اور مولانا کی جودتِ طبع کی داد دیجئے، پھر مسلمانوں کی بدقسمتی کا ماتم کیجئے کہ ان کے اہلِ نظر و فکر راہِ حق سے کس قدر دُور ہوتے جارہے ہیں، فتنہ خلقِ قرآن کی یہ تشریح بالکل غلط، اور واقعات کے خلاف ہے، بات اتنی تھی کہ مامون کو مناظرہ کا شوق تھا۔ عیسائیوں سے مناظرے میں کلام اللہ کو حادث کہا گیا۔ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) "کلمۃ اللہ" ہوکر مخلوق ہوئے، تو پھر قرآن کلام اللہ ہوتے ہوئے کیوں مخلوق اور حادث نہ ہوا۔ اُدھر سے مطالبہ ہوا کہ "تمہارے علماء تو قرآن کو مخلوق اور حادث نہیں کہتے" حکومت کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ دیر کیا تھی، دربار میں علماء کی طلبی ہوئی، کمزور دل والے، اور زمانہ ساز علماء کی کبھی کمی نہیں رہی،........ لیکن انہی میں چند ایسے اربابِ عزیمت و استقامت بھی تھے، جنہوں نے پُوری پامردی اور بہادری کے ساتھ اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ انہیں اذیتیں دی گئیں قیدخانوں میں طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ لاکھوں کے مجمع میں بلا بلا کر دُرّے مارے گئے۔ بدن زخموں سے چُور ہوگیا۔ مگر یہ اللہ کے بندے راہِ حق سے نہ ہٹے۔ اور تاریخ پر ایک مستقل نشان چھوڑ گئے۔ آج پُوری اسلامی تاریخ میں حسین بن علیؓ (رضی اللہ عنہ وعن والدیہ) کے بعد احمد بن حنبلؒ کا موقف اپنی نظیر نہیں رکھتا، دنیاوی اور مادہ پرست تحریکوں سے مقابلہ مقصود نہیں، مگر بہ سبیل تفنن عرض کیا جاتا ہے کہ اگر مولانا کا جی چاہے تو انقلابِ رُوس اور جدید ترکی کی تاریخ کھنگال کر دیکھ لیں ابن حنبلؒ کی استقامت اور برداشت کی مثال مشکل سے ملے گی۔

اُولٰٓئِکَ اٰبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِھِمْ ۔۔۔ اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

ذہانت اور اُپج سے ایک انوکھی بات کہہ دینا آسان ہے، مگر اسے ثابت کرنا مشکل ہے، کہاں عربی تفوّق کا جذبہ، اور کہاں ابنِ حنبل اور ان کے رفیقوں کا "افضل الجہاد"۔ شتّان مابین الارض والسّماء

ل اس کا سراغ الندیم کے ایک بیان سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو: (کتاب الفہرست مقالہ خامسہ فن ثالث ترجمہ ابن کلاب، ص ۱۸۰، طبع یورپ)

مولانا سندھی نے بھی زیادتی اور ظلم کی حد کر دی، ابن حنبلؒ کا تو یہ عالم تھا کہ کوڑے پڑ رہے ہیں، تہبند کھلا پڑتا ہے، بدن لہولہان ہو رہا ہے، وقت کا سب سے بڑا شہنشاہ (معتصم باللہ) کہتا ہے کہ اب بھی کہہ دو "صرف زبان سے مخلوق کا لفظ ادا کر دو، مگر لب پر جاری ہوتا ہے، تو یہ مشہور و ماثور فقرہ:۔

"اَعْطُوْنِیْ شَیْئًا مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ اَوْ سُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَقُوْلَ بِہٖ (جلاء العینین ص۱۶۳ ص۱۰۱)

مگر یہ یورپ کی مادیت کا لوہا ماننے والے کہتے ہیں کہ وہ پیکر صداقت و عاشق سنت صرف عربی زبان اور عربی تفوق کی خاطر اپنی جان گنوانے پر تلا ہوا تھا! اللہ جانتا ہے کہ ان ائمہ صدق و صفا کے ایمان و اخلاص پر اس سے زیادہ بدنما بہتان نہیں اٹھایا جا سکتا۔ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔ (الشعراء۔)

مولانا کہتے ہیں کہ "محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا جائے، یا اسے گول مول ہی رکھا جائے"۔۔ اس "گول مول" کی حقیقت یہ ہے کہ سلف کا ایک طبقہ صفات باری کے باب میں انتہائی محتاط تھا امام مالک کا مشہور قول ہے:۔ اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْکَیْفُ مَجْھُوْلٌ وَالسُّؤَالُ عَنْہُ بِدْعَۃٌ اسی طرح کلام الٰہی کے بارے میں ایک طبقہ کہتا تھا:" القران کلام اللہ لا اعرف مخلوق او غیر مخلوق"۔

"یہ گول مول ضرور ہے مگر ٹال مٹول کا گول مول نہیں، اس اجمال کی تہ میں عقیدہ کی پاکیزگی اور ایمان کا رسوخ ہے۔ اور یہ چیز استہزاء کی بجائے رشک کی مستحق ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور مولانا فرماتے ہیں:۔

"عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم تو من جانب اللہ مانتے تھے، لیکن قرآن کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور غیر فانی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے"۔

اس پر چند سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) دور عباسی کے وہ کون عجمی مسلمان تھے؟ کیا عقیدہ خلق قرآن کے قائلین اور منکرین کی تقسیم نسل اور قومیت کی بنیادوں پر تھی؟

(۲) قرآن کے الفاظ کو غیر قانونی تسلیم کرنے کے معنی یہ تو نہیں کہ وہ من جانب اللہ بھی نہیں؟ مولانا کے بعض بیانات سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے:۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ایک عجمی کی عقل یہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ اللہ کی تعلیم جو تمام زبانوں اور سب دُنیا کے لیے ہے وہ عربی اسلوبِ بیان اور عربی نظم الفاظ کی پابند ہو۔ عجمی ذہن کے لیے قرآن کے الفاظ کا غیر مخلوق سمجھنا ناممکن ہے۔ وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا" (ص ۲۶۶)

"وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا" ——— اس فقرے سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں کچھ اور تو نہیں مراد لیا جا رہا ہے؟ مولانا یہ بھی فرماتے ہیں:۔

"مامون کے زمانے میں عربوں کے پاس لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی، اور اب وہ اسے خاص الٰہی زبان منوانے پر مصر تھے" ص ۲۶۶

دریافت یہ کرنا ہے کہ آپ عربی زبان کو کسی درجے میں الٰہی زبان مانتے بھی ہیں؟ "خاص و عام" کی بحث تو بعد کی چیز ہے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، مسلک بالکل صاف ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو اس میں شک کرے، اس کے کفر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ یہ اللہ کا کلام (قرآن مجید) عربی زبان میں ہے تو اب عربی زبان الٰہی زبان ہوئی یا نہیں؟ مگر آپ کی عجمیت تو صرف "معانی ہی کو قرآن سمجھتی ہے"۔ اور آپ کے نزدیک اللہ کی تعلیم "عربی اسلوبِ بیان اور عربی نظم الفاظ کی پابند" ہو ہی نہیں سکتی۔

اب یہ باب ختم ہوتا ہے، آخر میں ایک قومی نعرہ اور سُن لیجئے۔ نعرہ ہے تو وطن پرستانہ مگر زبان علم اور حکمت کی اختیار کی گئی ہے۔

"مولانا کے نزدیک دہلی بھی دمشق و بغداد اور بخارا کی طرح مسلمانوں کے ایک مستقل مرکز کی حیثیت رکھتی ہے جس طرح عرب مسلمان ایک مستقل قوم تھے۔ اور ان کا سیاسی مرکز دمشق اور بغداد رہا۔ اور ایرانی مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور انہوں نے بخارا کو اپنا مرکز بنایا۔ اسی طرح ہندوستانی ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی زبان ہے۔ اپنا فقہی مذہب ہے۔ اپنا علم کلام اور خاص حکمت ہے۔ جس طرح ایرانیوں نے عربوں سے اپنی قومی شخصیت منوائی اور ایرانی زبان، ایرانی فقہ، ایرانی علم کلام، ایرانی تمدن مسلمانوں کی بین الاقوامی برادری کا ایک

مستقل جزو بن گئے۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمان بھی ایک مستقل قوم ہیں" صـ۲۰۲

ایرانیوں نے جس طرح اپنی قومی شخصیت منوائی، اس کی بڑی دردناک داستان ہے، اس کا ذکر نہ چھیڑا جاتا تو اچھا تھا، رہا مسلمانانِ ہند کا "اپنا فقہی مذہب" تو ہمیں اس کا علم نہیں، ان کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند ہے جو صرف ہندوستان میں محدود نہیں، امام اعظم اور ان کے جانشینوں کا مرتب کردہ فقہ افغانستان ترکستان اور عربی ملکوں میں بھی رائج ہے، نیز خود اہلِ ہند کی ایک بڑی تعداد "اہل حدیث" ہے جو محدثین کے طریقے پر چلنا اپنے لئے سرمایۂ سعادت خیال کرتی ہے۔ ممکن ہے مولانا کا دماغ، ان کا انکاری وجود تسلیم نہ کرتا ہو، مگر ان کا وجود ہے اور بہت نمایاں۔ موجودہ ہندوستان کے بعض چوٹی کے علماء عقائد اور فقہ دونوں میں مُحدّثین اور سلف کا مسلک رکھتے ہیں۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ "ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں" اب اس کی دلیلیں ملاحظہ فرمائیے۔

"اکبر تغلقوں کی طرح نہ تو قاہرہ کے عباسی خلفاء کی دینی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا اور نہ اسے اپنے باپ ہمایوں کی تقلید میں ایران کے شیعہ بادشاہوں کی سرداری گوارا تھی، چنانچہ اس نے ہندوستان میں ایک مستقل صاحب اقتدار سلطنت کی بنیاد رکھی، یہ خالص ہندوستانی سلطنت کی ابتداء تھی" (صـ۲۸۵)

یہ ہے مولانا کی "ہندوستانی سلطنت" کا نمونہ جس کا وہ خواب دیکھ رہے تھے، اکبری بدعات کے خلاف حضرت مُجدّد الف ثانیؒ کے جہاد سے کون واقف نہیں؟ اس کی تازہ تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"بدقسمتی سے ہندوستان کے حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ اس فکر سے ملک کی سیاسی زندگی میں خاطر خواہ نتائج نہ نکل سکے، بات یہ ہے کہ جس طرح مامون کے اقدام سے عربی ذہن کے تفوق پر زد پڑتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی طرح اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقوں نے محسوس کیا کہ اکبری مسلک سے اسلام کی برتری کو صدمہ پہنچے گا اور اس کے ساتھ ان کی سیادت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی، چنانچہ یہاں بھی اکبری فکر کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اور عالمگیر کے زمانے میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے رجحان کو حکومت کا اصول تسلیم کر لیا گیا" (صـ۳۸۹)

گویا امام ربانی بھی مسلمان حکمران طبقوں کے جذبۂ سیادت و تفوق کی تبلیغ کر رہے تھے۔ کہاں کی

بات کہاں جا پہنچی ہے؟

" ہندوستانی قومیت " کے پرستاروں کے نزدیک " اکبر اعظم " سے زیادہ چہیتا کون ہو سکتا ہے طبعی طور پر مولانا اس کے بڑے مداح ہیں :-

" چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرمانروا ہے ، جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی ، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع ۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی ، اور اسلام کے اصول وقوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور ان کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش " (ص ۲۹۳)

بالکل صحیح بالیقین اکبر کی حکومت ہندوستانی قومیت اور ہندو تمدن و تہذیب کو زندہ کرنا چاہتی تھی ، مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے اصول وقوانین کے اندر رہ کر ایسا کرنا ممکن بھی ہے ؟

" مولانا کے نزدیک وحدت الوجود کا عقیدہ اکبر کے فکر کی اساس تھا اور اسی پر اس کے دین کی بنیاد رکھی گئی تھی " (ص ۲۹۷ ، ص ۲۹۶)

معلوم نہیں " وحدت الوجود " کے ماننے والے ، مولانا کے اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ۔؟

اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوتا ہے ۔

" اکبری سیاست ایک دینی فکر کا نتیجہ تھا ۔ جس کا اساس وحدت الوجود کا عقیدہ تھا ..... جہانگیر کے زمانے میں امام ربانی نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کی تردید کی اور اس پر جس سیاست کی بنا پڑی تھی اسے غلط ٹھہرایا ۔ امام ربانی کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے با اقتدار سرداروں سے ان کی خط وکتابت رہتی تھی اور یوں بھی مسلمانوں کے حکمران طبقوں کا ان کی طرف مائل ہونا ایک طبعی امر تھا " (ص ۳۰۰)

دیکھیے وہی بات مولانا دوسرے انداز میں کہہ رہے ہیں ، کہنا یہی چاہتے ہیں کہ امام ربانی اس وقت کے مسلمان حکمران طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور انہیں اکبر کی بدعات اور اس کے بداندیش وزیروں کی بیہودہ حرکتوں سے کوئی خاص اصولی اختلاف نہیں تھا ۔ ورنہ مولانا سے زیادہ اسے کون جانتا ہے کہ معاملہ صرف ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کا نہیں تھا ، معاملہ دین کا تھا ۔ اکبر نے اس دین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں لے کر آئے تھے ۔ اگر حضرت امام ربانی مجاہدانہ میدان میں نہ

آتے تو نہ اورنگ زیب پیدا ہوتا، اور نہ ہم آپ اس حال میں ہوتے ——— لیکن ہمارے مولانا ہیں کہ اکبر کی شہنشاہیت کو "ہندوستانی اسلامی حکومت" کا نام دیئے جا رہے ہیں:-

" اکبر کی حکومت حقیقت میں ہندوستانی اسلامی حکومت تھی، اس کے سیاسی مسلک میں ہندوستانیت کو اسلامیت پر ترجیح دی گئی تھی کیونکہ ابتدائے کار میں اسلامی حکومت کو ہندوستانی بنانے کے لئے لابدی طور پر ہندستانیت پر زیادہ زور دینا چاہیے تھا" (ص ۳۰۹)

خاکسار عرض کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت ہندوستان میں تھی کہاں؟ جسے اکبر اور اس کے جانشین "ہندستانی" بنانا چاہتے تھے۔ مغلوں سے پہلے کی مسلمان حکومتوں کو کسی حال میں اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں! وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں جن میں بادشاہ اچھے بھی ہوتے تھے اور برے بھی۔ اکبر پہلا بادشاہ ہے جس کے دور میں وہ مسلمانیت بھی ختم کر دی گئی، اور صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ دین ہی کے بیخ و بن سے اکھاڑنے کی مہم شروع کر دی گئی اور ایک نئے "دین الٰہی" کی بنا ڈالی گئی۔ ممکن ہے مولانا کے نزدیک یہ "ہندستانیت" ہو، مگر کتاب و سنتِ رسول پر ایمان رکھنے والا اسے الحاد و زندقہ سمجھنے پر مجبور ہے۔

———

اورنگ زیب کی دینداری اور مذہبی پالیسی کی توجیہ بھی مولانا نے مخصوص انداز میں کی ہے جو سننے کے لائق ہے۔ ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ عالمگیر حجاز پر بھی اپنا اقتدار چاہتا تھا اور اس کی سیاست کی تہ میں اسلامی دنیا کی قیادت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ہم مولانا کو جھٹلانے کی جرأت تو کر نہیں سکتے، البتہ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ سازی کے لئے بھی کچھ قرائن اور شہادت کی ضرورت ہوا کرتی ہے ——— بہرحال مولانا کی توجیہ ملاحظہ ہو۔

" اکبر کی سلطنت ہندستانی اسلامی سلطنت تھی، اورنگ زیب چاہتا تھا کہ وہ اس ہندستانی اسلامی سلطنت کے دائرۂ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آ جائیں اور حجاز پر بھی اس کا اقتدار ہو۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا . . . . . . اورنگ زیب کے پیش نظر ہندستان کے علاوہ اسلامی دنیا کی قیادت بھی، اس لیے (اس نے) اسلامیت کو مقدم جانا"

مولانا کو "جمع اضداد" میں کمال حاصل ہے۔ وہ اکبر اور عالمگیر دونوں کے مداح ہیں۔ اکبر پر اس لیے

فریفتہ ہیں کہ اس نے "خالص قومی ہندستانی سلطنت" کی بنا ڈالی اور عالمگیر کی یہ ادا انہیں بھاتی ہے کہ اس نے بیرون ہند میں ہندستان کی عظمت کا جھنڈا بلند کیا۔

"دوسرے لفظوں میں اشوک سے ہزارہا سال کے بعد ایک بار پھر ہندستانی اس قابل ہوئے کہ وہ دوسروں کی سیاسی اور فکری ترکتازیوں کی آماجگاہ بننے کی بجائے اپنا پیغام باہر کی دنیا کو سنائیں، گو اشوک کے زمانے میں یہ پیغام بدھ مت کا تھا اور عالمگیر کے عہد میں یہ امام ربانی مجدد الف ثانی کا پیغام تجدید اسلام تھا۔" (ص ۳۱۶)

"فکری ترکتازیوں" کا فقرہ قابل غور ہے۔ شاید مولانا کے نزدیک اسلام اور متقدمین ائمہ اسلام کے اثرات بھی "فکری ترکتازیوں" میں داخل ہوں۔

مولانا سندھی ہندستان میں حکمت ولی اللہی کے داعی ہیں اور انہیں شاہ صاحبؒ کی کتابوں پر بے نظیر عبور حاصل ہے۔ مگر وہ شاہ صاحبؒ کے افکار جس طرح پیش کرتے ہیں اس سے خود شاہ صاحبؒ سے بدگمانی ہونے لگتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ بھی اکبر اور عالمگیر دونوں کے قائل تھے —— شاہ صاحبؒ اکبر کے قائل ہوں، اس کی سیاست کے ثناخوان ہوں۔ بات ناقابل اعتبار ہے جب تک صریح شہادت نہ پیش کی جائے —— بہرحال مولانا کا بیان ملاحظہ ہو۔

"...... اہل فکر کی یہ جماعت سلطنت کے ان لوگوں سے واقف تھی، وہ اکبر کے سیاسی اعمال کے حامی نہ تھے۔ لیکن جس نہج پر اکبر نے مختلف ملتوں کو ہمنوا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اصولاً اس سے متفق تھے۔ اسی طرح وہ عالمگیر کی اسلام پرستی کے قائل تھے، لیکن اسلام پرستی نے امور سلطنت میں جو سخت گیری کی روش اختیار کی تھی، اس کے خلاف تھے۔ شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم اور ان کے ہونہار فرزند امام ولی اللہ ان کے افکار کے مرتب کرنے والے ہیں۔" (ص ۳۱۹)

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کا مصنف اس "نہج" سے "اصولی طور پر متفق ہو" جو اکبر نے مختلف ملتوں کو ایک کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔؟

زیر نظر کتاب میں ایک باب ولی اللہی سیاسی تحریک پر بھی ہے (ص ۳۲۱، ص ۳۳۱) یہ گویا مولانا کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کا خلاصہ ہے۔ اس "خلاصہ" میں بھی مجددین کے محدثین، عام

اہل حدیث اور بدنام و مظلوم وہابیوں پر نظرِ عنایت مبذول ہوئی ہے (ص ۳۳۵) جسے ہم یہاں نظرانداز کرتے ہیں کہ ان پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے (معارف۔ فروری، مئی ۲۳ء)

کانگریس پر بھی مولانا کے افکار قابلِ دید ہیں (ص ۳۴۰، ص ۳۴۱) مگر ہمیں اُن کی توجیہ و تشریح سے اتفاق نہیں کہ ہم وطنیت اور قومیت کو اسلام کے لئے زہرِ قاتل سمجھتے ہیں، اور مولانا اس کے سرگرم داعی ہیں. وہ ہر فکر میں وطن پرستی کا سراغ لگا لیتے ہیں، البتہ انہوں نے گاندھی جی اور کانگریس کی ہندوانہ قومیت سے متعلق بڑی معقول باتیں کہی ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب کی سیاست پر بھی دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی ہے:۔

"مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے مولانا حسین احمد، مصطفےٰ کمال کی ترکی تحریک کے تو خلاف ہیں لیکن حکومت برطانیہ کی عداوت میں اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ گاندھی جی ہندستانی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی شخصیت کو کس قدر نقصان پہنچنے کا امکان ہے" (ص ۳۵۹)

اس تحریر کے ختم کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ مولانا کا ایک وطن پرستانہ "رجز" ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کر دیا جائے۔ خوبی یہ ہے کہ اس رجز کی تصنیف کا سہرا بڑے بڑے بزرگوں کے سر باندھا گیا ہے:۔

"دیوبندی اسکول ہند کو کیا سمجھتا ہے۔ اس کے لئے سُبحۃ المرجان نام کی عربی تاریخ ہند پڑھیے۔ قدیم مذاہب ہند کے متعلق ان کے نظریات مرزا مظہر جان جاناں اور امام عبدالعزیز دہلوی کے مکتوبات میں ملیں گے ——— میں ان کی ترجمانی مختصر الفاظ میں یہاں کرتا ہوں۔ ہمارا ہندوستان دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان رفعت کا مالک ہے۔ پہلے دَور میں اس نے سنسکرت جیسی زبان پیدا کی۔ کلیلہ و دمنہ جیسی حکمت کی کتاب لکھی۔ فوجی تمرین کا کھیل شطرنج ایجاد کیا۔ ریاضی میں یونان کا ہمسر بنا۔ الٰہیات میں ویدانت فلاسفی سکھانے میں "جگت گرو" بنا۔ اس سے ویدک دھرم اور بدھ دھرم دنیا میں پھیلے۔ اس نے مہاراجا اشوک جیسے حکمران پیدا کئے۔ دُوسرے دَور میں قدیم انسانیت کی علمبردار سوسائٹی کو اسلام جیسے انٹرنیشنل پروگرام سے آشنا کرنے والا جلال الدین اکبر پیدا کیا۔ مشرقی ایشیا کی زبانوں کو ملا کر اُردو جیسی

انٹرنیشنل زبان پیدا کی۔ محی الدین عالمگیر جیسا سلطان پیدا کیا جو تمام ممالکِ ہند کو ایک قانون کا پابند بنانا سکھا گیا۔ امام ولی اللہ جیسا فلاسفر پیدا کیا۔" (ص ۳۴۸-۹)

اس "رجز" کے اور مصرعے جیسے بھی ہوں، مگر اکبر والا مصرعہ تو یقیناً "غیر موزوں" ہے۔ کہاں مولانا کا چہیتا اکبرِ اعظم اور کہاں اسلام کی دعوت۔ اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے۔

اِرادہ ایک مختصر تبصرہ لکھنے کا تھا، مگر کوشش کے باوجود یہ تحریر کچھ نہ کچھ طویل ہو ہی گئی، پھر بھی نقد کا حق ادا نہ ہُوا۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحبِ نظر عالم پُوری کتاب پر بسط و شرح کے ساتھ گہری تنقید کرے۔ راقم نے اپنی بساط کے مطابق صرف نمایاں اَور زیادہ قابلِ اعتراض حصّوں کی نشان دہی کر دی ہے۔

مطبوعات دارالدعوۃ السلفیہ

حج مسنون	مولانا مختار احمد ندوی
اہلحدیث اور اہل تقلید	حافظ صلاح الدین یوسف
تعلیم الصیام	نواب صدیق حسن خان قنوجی رح
تعلیم الزکوۃ	نواب صدیق حسن خان قنوجی رح
مسئلہ رفع الیدین	مولانا ارشاد الحق اثری
کتاب التوحید	شیخ محمد بن عبدالوہابؒ
اسلام اور مسائل جاہلیت	مترجم مولانا مختار احمد ندوی
قرآن خوانی اور ایصال ثواب	مولانا مختار احمد ندوی
زیارۃ القبور	شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ
عدتِ رحم کی شرعی حیثیت	حافظ صلاح الدین یوسف
کربلا کی کہانی حضرت ابوجعفرؒ باقر کی زبانی	مولانا محمد عطاء اللہ حنیف
اسلام اور قبروں پر عرس	مولانا محمد عطاء اللہ حنیف
تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ (عربی) ۳ حصے	تحقیق مولانا محمد عطاء اللہ حنیف

منتقی الاخبار (مترجم اُردو) شیخ عبدالسلام ابن تیمیہؒ صفحات دو ہزار۔ اعلیٰ کاغذ دو خوبصورت جلدیں

المحلّی (اردو)	مترجم مولانا غلام احمد حریری
مسائل احکام رمضان المبارک	مولانا احمد اللہ صاحب دہلوی
دین انسانی کی حقیقت	صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری
چند غلط فہمیوں کا ازالہ	حافظ صلاح الدین یوسف
علمی جائزہ (بہ سلسلہ مرزائیت)	مولانا فضل الرحمٰن ایم۔اے
امام خمینی اور شیعیت	مولانا محمد منظور نعمانی
آخری چہار شنبہ کی تاریخی حقیقت	مولانا فضل الرحمٰن۔ ایم۔اے
اہلحدیث کا مذہب	شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری
تمیمۃ الصبی فی ترجمۃ الاربعین من احادیث النبیؐ	نواب صدیق حسن خانؒ

دارالدعوۃ السلفیۃ شیش محل روڈ لاہور۲